التخییر من التفسیر

سورۂ آلِ عمران

حضرت مولانا بیضاوی رحمہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ

برائے ایم

از

محمد حمزہ نعیم ایم۔اے (عربی)

... خانہ ۔ اُردو بازار۔ لاہور

التخبیر من التفسیر

سورۃ آل عمران

حضرت علامہ بیضاویؒ کی تفسیر آل عمران کا متن مع ترجمہ

از

محمد حمزہ نعیم ایم۔اے (عربی)

علمی کتاب خانہ اردو بازار۔ لاہور

فون ۶۲۸۳۲

مطبوعہ: پنجاب پریس لاہور

عرضِ مؤلف

ابتدا ہے نام اللہ سے بیاں
جو ہے بخشش کرنے والا مہرباں

تفسیر بیضاوی سورۃ آلِ عمران مدت مدید سے پنجاب یونیورسٹی ایم اے عربی کے نصاب میں داخل چلی آتی ہے اور یہی نصاب کئی ایک ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں متداول ہے۔ علامہ بیضاوی نے جس طرح اپنی اس تصنیف میں ایجاز و اجمال سے کام لے کر ایک بحرِ ذخّار کو کوزے میں بند کیا ہے وہ کسی تفسیری ذوق رکھنے والے شخص سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس تفسیر میں صرف بھی ہے نحو بھی، فقہ بھی ہے کلام بھی، روایت بھی ہے درایت بھی، ادب بھی ہے تاریخ بھی اور اختلافِ قراءت پر بھی بحث کی گئی ہے اور خوارج کے اعتراضات کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔ غرض اس میں علامہ بیضاوی نے ایک ایسی کوشش کی ہے جسے ہر زمانے میں اور ہر گوشۂ عالم میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور علمی اور ادبی حلقوں میں اسے خاص اہمیت دی گئی ہے ــــ عرب یونیورسٹیوں میں اسے پڑھایا گیا، برلن، لندن اور دیگر کئی مغربی یونیورسٹیوں میں اسے شاملِ نصاب کیا گیا، عربی دینی مدارس میں اسے ایک خاص مقام دیا گیا اور برصغیر پاک و ہند کی ہر بڑی یونیورسٹی میں یہ تفسیر اپنا مقام حاصل کیے رہی۔ اس کی مزید اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بیسیوں حاشیے اس تفسیر کے لکھے گئے اور پھر حاشیوں پر مزید حاشیے سپردِ قلم کیے گئے۔ انہی حاشیوں میں اُن اجمالی امور کی تفصیل کی گئی ہے جنہیں علامہ نے فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر کہہ کر چھوڑ دیا تھا۔

استاذ مکرم جناب مولینا حافظ نور الحسن خاں صاحب استاذ تفسیر پنجاب یونیورسٹی کے سامنے جب زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا تو اس بات کا پوری طرح اندازہ ہوا کہ تفسیر بیضاوی کے طرزِ بیان اور طریقِ تنقید اور دیگر تفاسیر میں کتنا بڑا فرق ہے اور یہ کہ ایک عام سطح کا طالب العلم ان پیچیدہ اور قواعد و اختلاف قراءت میں الجھے ہوئے مسائل کو کس قدر مشکل پاتا ہوگا جبکہ ذہین طلبہ کو بھی دو اڑھائی آیت کی تفسیر سننے کے بعد اپنا دامنِ طلب سمیٹے بنتی ہے۔

جامعہ پنجاب میں داخلے کے بعد پہلے دو چار ماہ تو ہم بھی یہ تماشا دیکھا کیے مگر بالآخر یہ ارادہ پختہ کر لیا کہ اس پُر پیچ و خم راہ کو صرف طے ہی نہیں کریں گے بلکہ مقدور بھر اسے دوسروں کے لیے سہل و صاف بنا کے رہیں گے۔

تفصیلی نوٹ لکھنے کی مجھے عادت نہ تھی صرف نکات و رموز کے لیے ایک کاپی بنا چھوڑی تھی۔ مگر جلد احساس ہوا کہ مجھے تو دوسروں کے لیے بھی سہولت مہیا کرنا ہے لہٰذا اس عرصے میں جو کتاب پڑھ چکے تھے اس کے تمام نکات اور تفصیل تحت الشعور سے شعور میں لا کر قلمبند کرنا شروع کیا اور پھر ہر مغلق مسئلہ پر استاذِ مکرم سے تفصیل و تسہیل چاہی۔ پھر اس پر اضافے اور تشریح کی خاطر انوار التنزیل کے کئی ایک حواشی دیکھے اور جو موتی حاصل ہوتے گئے اس خزینہ میں جمع کرتا گیا۔

اسی سلسلے میں استاذ گرامی قدر ڈاکٹر رانا م۔ ن احسان الٰہی صاحب صدر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور نہایت مفید مشوروں سے نوازا۔ غیر ملکی زبانوں میں بھی تفسیر بیضاوی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ برطانوی یونیورسٹیوں کے طلبہ کے استفادہ کی غرض سے آلعمران (بیضاوی) کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا۔ یہ ترجمہ ہمارے یہاں نایاب ہے مگر اس

میں کچھ تحقیق و تدقیق سے زیادہ کام نہ لیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں ترجمہ میں کئی ایسی خامیاں رہ گئی تھیں جن کی ترمیم و اصلاح نہایت لابدی تھی۔ پھر اس میں بعض مقامات پر ترجمہ بھی غلط چھپا تھا۔ استاذیم ڈاکٹر رانا صاحب نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ ڈاکٹر صاحب کی شفیقانہ حوصلہ افزائی سے بندہ نے اس کتاب کو دوبارہ جلد مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور حلقۂ احباب میں سے محترم مکرم محمد انور خاں صاحب ایم اے لیکچرار اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور، محترم خواجہ اختر احمد صاحب ایم اے اور محترم رانا احسان الرحمن صاحب نے ہر قدم پر مجھے مفید مشوروں سے مستفید کیا۔ اور اب اس کتاب کو بہ ہر امکان اس طرح تالیف کیا گیا ہے کہ اس سے طلبۂ جامعہ کے علاوہ عربی مدارس کے طلبہ اور عام شائقینِ تفسیر و ادب بھی یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔

اس کتاب میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے:

۱۔ متنِ قرآن مجید کو مشکول کر دیا گیا ہے۔

۲۔ متن بیضاوی کا ترجمہ سلیس اور آسان اردو میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ مشکل الفاظ کی وضاحت یا زائد جملے جو متن کی توضیح میں آئے ہیں انھیں قوسین میں رکھا گیا ہے، اس طرح کہ اگر قوسین کے مابین کے الفاظ اور جملے وغیرہ حذف بھی کر دیں تو عبارت کی روانی قائم رہے۔

۴۔ اصطلاحات قواعد اور دیگر پیچیدہ مسائل کو بھی قوسین میں واضح کیا گیا ہے۔

۵۔ اختلافِ قراءت یا دوسرے مسائل علمی، ادبی و دینی وغیرہ جو کسی آیت کے تحت آتے ہیں انھیں الگ الگ نمبروار لکھا گیا ہے تاکہ سمجھنے اور یاد رکھنے میں سہولت رہے۔

جہاں تک اس کتاب کے نام کا تعلق ہے میرے خیال میں اس کا نام "التخییر من التفسیر" نہایت مناسب رہے گا۔ تسہیل تفسیر کے سلسلے کی دوسری کتاب "الاختیار من المنار" انشاءاللہ اس کتاب کے فوراً بعد ہی پیش کر دی جائے گی جو الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہٗ المصری کی تفسیر المنار میں سے تیسویں پارے کے رُبع آخر متن مع ترجمہ و توضیح اُردو پر مشتمل ہو گی۔

وعلی اللہ التوفیق و الاعانۃ

۱۷ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ

محمد حمزہ نعیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

سُبْحَانَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا

قرآن پاک کی بعض سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات آئے ہیں ان کے بارے میں علمائے مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ اُن سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتدا میں یہ آئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان سے ایک کلام کے منقطع ہونے اور دوسری کے شروع ہونے پر تنبیہ مقصود ہے۔ یعنی ان کے لانے سے یہ غرض ہے کہ وہ پہلے کلام کے انقطاع اور دوسرے کلام کے از سرِ نو شروع ہونے پر دلالت کریں۔ بعض کا خیال ہے کہ حروفِ مقطعات سے اُن کلمات کی طرف اشارہ ہے جن سے یہ اختصار کیے گئے۔ مثلاً ایک نامور عرب شاعر کا قول ہے ع "فَقُلْتُ لَهَا قِفِیْ فَقَالَتْ لِیْ قَاف" یہاں "ق" میں یہ اشارہ ہے کہ اس کلمہ میں سے کچھ حروف حذف کیے گئے ہیں یعنی وَقَفْتُ کی جگہ "ق" استعمال ہوا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ "ا" سے مراد "اللہ" اور "م" میں مراد "محمدؐ" ہے پھر درمیان میں "ل" جبریل کے لئے لایا گیا یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام بواسطۂ جبریل محمدؐ علیہ السلام تک پہنچا۔ مگر قاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بن محمد الشیرازی البیضاوی نے جو مفسرین کے طبقہ میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں ان تمام توجیہات سے پہلوتہی کرتے ہوئے ایک نہایت معرکۃ الآراء توجیہہ کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

اس لئے ان میں سے بعض حروف کے ساتھ قرآن پاک کی ابتدا کی گئی۔ پھر ان میں سے بعض سورتوں کی ابتدا انہی سے کی۔ گویا ان لوگوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے جو

قرآن پاک کے منزّل ہونے کا انکار کرتے ہیں اور اسے غیرِ خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔ کہ جو کلام تمہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے انہی حروف سے مرکب ہے جن سے تم اپنے کلام کو ترتیب دیتے ہو، پھر اگر یہ خدا کا کلام نہیں تو تم کیوں اس جیسا کلام نہیں بنا لاتے۔ نیز حروف تہجّی اس لئے بھی سورتوں کی ابتدا میں لائے گئے کہ سب سے پہلے جو چیز سامعین کے کانوں تک پہنچے وہ اعجاز کی ایک مستقل نوع ہو۔ پھر ایک اُمّی شخص کا جس نے کسی مکتب کا دروازہ تک نہ دیکھا ہو، نہ کسی کاتب کے پاس بیٹھا ہو ان حروف کا ذکر کرنا صریح معجزہ ہے۔ علاوہ ازیں ان حروف کے لانے میں ان نکات کو حقائق کی رعایت دی گئی جن سے بڑے سے بڑا ادیب جو فنِ ادب میں مشہور اور صاحب فوقیت ہو محض عاجز اور قاصر رہتا ہے۔

سُوۡرَةُ آلِ عِمۡرَانَ مَدَنِيَّةٌ آيَاتُهَا مِأَتَانِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ اُن کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں۔

قرأتِ مشہورہ میں "میم" کو مفتوح پڑھا گیا ہے حالانکہ اس پر وقف کرنا زیادہ مناسب اور قرینِ قیاس تھا (کیونکہ حروفِ مقطعات سے اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک کے انقطاع کے بعد از سرِ نو شروع ہونے پر دلالت کرے)۔ اور یہ 'میم' کا فتحہ دراصل ہمزہ کی حرکت تھی جو میم کی طرف منتقل کیا گیا تاکہ ثابت ہو کہ ہمزہ قطعی (اور حکماً ثابت) ہے۔ اور یہ کہ وہ تخفیف کی غرض سے ساقط کیا گیا، نہ کہ درجِ کلام کی وجہ سے، کیونکہ "میم" حکم وقف میں ہے۔ جس طرح کہتے ہیں وَاحِدِ اثْنَانِ اور ہمزہ کی حرکت "دال" کو دے دی جاتی ہے۔ یہ بوجہ التقاء ساکنین نہیں ہوا

کیونکہ وقف کی صورت میں التقاء ساکنین جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "لام" کہتے ہوئے "م" کو ساکن ہی رکھا اور "ل" کے بعد "ا" اور "م" دونوں کو ساکن ہی پڑھا گیا۔ التقائے ساکنین والے اصول کے وہم کی بنا پر الٓمّٓ میں "م" کو کسرہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر قاری ابوبکر نے الم پر وقف ہی کر دیا اور اگلی آیت سے نیا جملہ شروع کیا۔

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وہ زندہ (باویہ) ہیں۔ سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں۔

روایت ہے کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا نام (اسم اعظم) تین سورتوں میں ہے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم" الآیہ سورۃ آل عمران میں "اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم" الآیہ اور سورۃ طٰہٰ میں "وعنتِ الوجوہ للحیّ القیوم" میں۔

نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے۔

آپ پر کتاب نازل فرمائی اور وہ قرآن مجید ہے جو تھوڑا تھوڑا وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔

بِالْحَقِّ واقعیت کے ساتھ۔

یعنی عدل کے ساتھ یا یہ کہ وہ اپنی خبروں میں جو اس نے بہم پہنچائیں سچا ہے۔ یا یہ کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ نازل ہوا جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ہی نازل فرمایا اور بالحق یہاں قواعد کی رُو سے حال واقع ہوا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ اس کیفیت کے ساتھ کہ وہ تصدیق کرتا ہے اُن (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔

اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ اور (اسی طرح بھیجا تھا) توریت اور انجیل کو۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم آنے تک ملتوی ہے کہ ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے (اور)

حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

حکمت والا ہے اور بعضے ایسے ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ (اسلام کو) ضرر پہنچائیں اور (اس میں بیٹھ بیٹھکر) کفر کی باتیں کریں اور ایمانداروں میں

وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ

تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا اور رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری کچھ نیت نہیں

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔

اور مدینہ والوں میں سے کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ یہ لوگ اور ہیں کہ جن کا معاملہ حکم الٰہی کے آنے تک ملتوی ہے، خواہ عدم شرکت غزوہ تبوک پر ان کو سزا دے اور خواہ انکی عدم شرکت کو معاف فرمادے، اور حق تعالیٰ ان کی توبہ اور تخلیف کو خوب جاننے والا ہے، اور اس فیصلہ فرمانے میں بڑی حکمت والا ہے۔

عبداللہ بن ابی، جد بن قیس، معتب بن قشیر اور ان کے ساتھی جو کہ تقریباً سترہ ہیں، انہوں نے ان اغراض کیلئے مسجد بنائی کہ اسلام اور مومنین کو ضرر پہنچائیں، اور کفر و نفاق پر ثابت رہیں۔

اور اس وجہ سے کہ ایمان داروں میں تفریق ڈالیں کہ ایک جماعت ان کی مسجد میں نماز پڑھے اور ایک جماعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز پڑھے، اور اس شخص کے قیام کا انتظار کریں، جو ان سے پہلے ہی سے خدا اور اس کے رسول کا دشمن ہے، مراد اس سے ابو عامر راہب ہے، جس نے عیاذ باللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فاسق کہا تھا، اور پوچھو تو قسمیں کھا جائیں گے کہ اس مسجد بنانے سے بجز مسلمانوں کے ساتھ بھلائی اور نیکی کے ہماری اور کوئی نیت نہیں، تاکہ جس کی مسجد قبا میں نماز فوت ہو جائے اور اسے وہاں جماعت نہ ملے وہ اس مسجد میں آکر نماز پڑھ لے۔

اور حق تعالیٰ گواہ ہے کہ یہ اپنی قسموں میں جھوٹے ہیں۔

(لباب النقول فی اسباب النزول)

فرمان خداوندی وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا الخ۔ ابن مردویہ نے ابن اسحاق کے طریق سے نقل کیا ہے کہ ابن شہاب زہری نے بواسطہ اکیمہ لیثی، ابورہم غفاری سے نقل کیا ہے، اور ابورہم غفاری ان حضرات میں سے ہیں، جنہوں نے درخت کے نیچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی، بیان کرتے ہیں کہ جنہوں نے مسجد ضرار بنائی تھی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ تبوک کی طرف روانگی کی تیاری کر رہے تھے، اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ہم نے یہ مسجد ضرورت مند اور حاجت مندوں اور سرد راتوں اور بارش والی راتوں کے لئے بنائی ہے اور ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ ہمارے لئے اس مسجد میں تشریف لاکر نماز پڑھ دیجئے۔

آپ نے فرمایا اس وقت تو ہم سفر کی تیاری میں ہیں، سفر سے جس وقت واپس آئیں گے تو انشاء اللہ تمہاری مسجد میں آکر نماز پڑھ دیں گے، جب آپ تبوک سے واپس ہوئے تو ذی اوان مقام پر پڑاؤ فرمایا، جہاں سے مدینہ منورہ کا ایک گھنٹہ کا راستہ تھا، اس وقت حق تعالیٰ نے اس مسجد کے بارے میں یہ آیتیں نازل فرمائیں وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا الخ۔

تاہم توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر (عبرانی زبان میں) اور انجیل جناب عیسیٰ علیہ السلام پر (سریانی زبان میں) یکبارگی نازل ہوئیں بخلاف قرآن مجید کے کہ وہ حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اور یہ کہنا کہ توراۃ کا مادّہ "ودی" ہے اور انجیل کا "نجل" اور اُن کا وزن "تفعلہ" اور "إفعیل" ہے، درست نہیں کیونکہ یہ دونوں غیر عربی کلمات ہیں اور اس بات کی تائید اُس قرأت سے ہوتی ہے جس میں أنجیل ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا بحالانکہ "أفعیل" عربوں کے ہاں کوئی بنا (وزنِ کلمہ) نہیں۔ ابوعمرو، ابن ذکوان اور کسائیؒ نے توراۃ کو تمام قرآن مجید میں إمالہ سے (توریت) پڑھا ہے اور نافع اور حمزہ نے (نہ پورا ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، نہ پورا إمالہ کے ساتھ بلکہ دونوں کے) بین بین پڑھا ہے اور قاری قالون نے باقی قُرّاء کی طرح فتحہ کے ساتھ یعنی بغیر امالہ کے ہی پڑھا ہے۔

مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ اس سے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے۔

توراۃ و انجیل کو قرآن مجید سے پہلے نازل فرمایا۔ وہ بھی لوگوں کے لئے باعثِ ہدایت بخشیں، عمومی طور پر اگر ہم یہ کہیں کہ ہم بھی شرائع ماقبل مذکورہ کے مکلّف ہیں۔ بصورتِ دیگر "النّاس" سے مراد وہی لوگ ہیں جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم۔

وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ اور اللہ تعالیٰ نے بھیجے معجزات۔

ممکن ہے فرقان سے مراد تمام جنسِ کتب سماویّہ ہوں کیونکہ یہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔ قرآن مجید، توراۃ اور انجیل تین کتابوں کے بعد فرقان کہہ کر اُن کے علاوہ دوسری کتابوں اور صحائف کو بھی شامل کیا، گویا یوں ارشاد فرمایا کہ اُسی نے وہ سب کچھ نازل فرمایا جو حق و باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ یا[۱] فرقان سے مراد "زبور" ہو یا[۲] "قرآن مجید" ہی مراد ہو اور اس

کا ذکر دوبارہ اس لئے کیا گیا کہ اس کی مدح، عظمت، شان اور باقی کتابوں پہ فضیلت ظاہر کی جائے کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اس لحاظ سے تو قرآن پاک کی ہم پلہ ہیں کہ وہ بھی خدا تعالیٰ ہی کی نازل کی ہوئی ہیں مگر قرآن مجید اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ "عاجز کردینے والا" ہے (اپنے مقابل کو) فرق کر دینے والا ہے حق و باطل کے درمیان۔ یا پھر فرقان سے مراد "معجزات" ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ بیشک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے۔

خواہ وہ کتبِ منزلہ کی آیات ہوں یا ان کے علاوہ نشانیاں (جو زمین و آسمان میں پائی جاتی ہیں)۔

لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ اُن کے لئے سزائے سخت ہے۔

اُن کے کفر کی وجہ سے۔

وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ اور اللہ تعالیٰ غلبہ (اور قدرت) والے ہیں۔

عذاب کرنے سے اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔

ذُوانْتِقَامٍ بدلہ لینے والے ہیں۔

جس طرح وہ بدلہ لے سکتے ہیں کوئی اور نہیں لے سکتا۔ اور "نِقمہ" مجرم کی سزا کو کہا جاتا ہے اور اس مصدر سے فعل عین کلمہ کے فتحہ اور کسرہ دونوں سے آتا ہے (یعنی باب "ضرب یضرب" سے بھی اور سمع (سمع) سے بھی) اور یہ وعید ہے جو توحید کے ثابت کرنے اور صاحبِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قابلِ اعتماد اور مخصوص اشارہ کرنے کے بعد عظمت بتانے کی خاطر لائی گئی اور اس سے منہ موڑنے پر سخت دھمکی دی گئی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ

بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، نہ (کوئی چیز) زمین میں اور نہ (کوئی چیز) آسمان میں۔

یعنی اس عالم میں وجود رکھنے والی چیز خواہ کلی ہو یا جزئی، ایمان ہو یا کفر یہاں کائنات کی تحدید سماء وارض سے کی ہے کیونکہ انسانی حس ان دونوں سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور زمین کو آسمان سے مقدم کیا کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بالتدریج توجہ دلائی جائے۔ اور اس (زمین و آسمان) کا ذکر اس لئے بھی کیا کہ ان کے درمیان جو اعمال بھی کئے جائیں گے وہ اللہ پر مخفی نہیں۔ اور یہ آیہ اللہ تعالیٰ کے "حیّ" ہونے پر دلیل کی طرح ہے (کہ اس سے دلیل مستنبط ہوتی ہے) اور اس کا یہ فرمانا

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ وہ ایسی ذات (پاک) ہے کہ تمہاری صورت (شکل) بناتا ہے ارحام میں جس طرح چاہتا ہے۔

یعنی مختلف صورتیں دیتا ہے اور یہ دلیل کی مانند ہے اللہ تعالیٰ کے "قیوم" ہونے پر۔ یعنی وہ صورتیں جیسے چاہتا ہے دیتا ہے (تو اس سے مستنبط ہوا کہ اللہ تعالیٰ "قیوم" ہیں) اور استدلال یوں ہے کہ وہ رحم مادر میں بچے کی تخلیق اور اس کی صورت کے متعلق اپنے فعل کی پختگی کو جانتا ہے۔ اور اس کی ایک قرأت "تَصَوَّرَكُمْ" بھی ہے (باب تفعل میں خاصۂ اتخاذ ہے) یعنی اُس نے تمہیں اپنی ذات کے لئے اور اپنی عبادت کے لئے تخلیق و تشکیل کرکے یہاں بھیجا۔

لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اُس کے۔

کیونکہ کوئی بھی وہ سب کچھ نہیں جانتا جو وہ جانتا ہے اور کوئی بھی کسی کام کے لئے اتنی قدرت نہیں رکھتا جتنی وہ رکھتا ہے۔

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وہ غلبہ والے ہیں حکمت والے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور حکمت کے غیر متناہی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔
کہا گیا ہے کہ یہ اُن لوگوں کے خلاف دلیل ہے جو خیال کرتے تھے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام بھی "رَبّ" تھے۔ کیونکہ "وفدِ نجران" نے جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس بارے میں جھگڑا کیا تو یہ سورۃ ابتدا سے کچھ اُوپر اسّی آیات نازل ہوئی۔ اس سے وہ دلیل جو اُن پر قائم کی گئی تھی ثابت کر دی گئی اور اُن کے شبہ کا جواب دے دیا گیا۔ (اُن کے دلائل کا ردّ اور شبہات کا ازالہ ہے)

هُوَ الَّذِيٓ أَنزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ۔
وہ ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو جس میں سے ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو اشتباہِ مراد سے محفوظ ہیں۔

یعنی اُن آیات میں نہ اجمال ہے (کہ مطلب صاف واضح نہ ہو) اور نہ احتمال ہے (کہ مطلب کئی طرح سے ہو سکے)۔

هُنَّ أُمُّ الۡكِتٰبِ اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں اُس کتاب کا۔
(قاموس میں اُمّ کے معنٰی ماں کے ہیں اور چیز کی اصل اور جڑ کو بھی اُمّ کہتے ہیں) یہ آیات کلام پاک کا اصل ہیں کہ باقی آیات بھی (جو متشابہ ہیں) انہی کی طرف لوٹتی ہیں (یعنی ان کی روشنی میں حل کی جاتی ہیں۔) اور قواعد کی رُو سے هُنَّ کی خبر اُمّ کی بجائے اُمّہات ہونا چاہیے تھا مگر یہاں واحد ہے تو اس لیے کہ ہر ایک ایسی آیت انفرادی طور پر "اُمّ الکتٰب" ہے یا تمام آیات بمنزلہ آیہ واحدہ کے ہیں۔

وَأُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں۔
ان میں احتمال ہے یعنی کئی معنٰی نکل سکتے ہیں اور اجمال (یعنی اختصار) کی وجہ سے بظاہر میں دوسری آیات کی مخالف ہوتی ہوں شریعت کی مخالفت کی

وجہ سے ان کا مقصود واضح نہیں ہوسکتا ہاں اُس میں انتہائی غور و غوض اور جانچ پڑتال کرنے سے اُس کا مقصود پایا جا سکتا ہے (اور متشابہات کا ایک مقصد یہ بھی ہے) کہ ان میں علماء کی فضیلت کا دروازہ کھلا رہے اور اُن میں غور و فکر کرنے میں محنت و اجتہاد کرنے پر اور اُن پر متوقّف علوم کے حصول پر اُن آیات کے اصل مقصود کے ڈھونڈ نکالنے کی غرض سے اُن کا حرص اور لالچ بڑھ سکے۔ پھر وہ اُن کے معانی نکالنے میں اور اُن (متشابہات) میں اور محکمات میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے طبیعتوں کو تھکا دیں اور اس طرح بلند مراتب اور اعلیٰ درجات حاصل کر سکیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "الٓرٰ کتٰب اُحکمت اٰیاتہٗ" تو اس کا یہ معنیٰ ہے کہ تمام آیات صحت معنیٰ اور جزالت لفظی میں ایک دوسری سے متشابہ ہیں (مذکورہ صدر آیہ میں تو معنیٰ کے واضح اور خفی ہونے کے اعتبار سے فرق بتایا گیا ہے) اور اُخَر، اُخْریٰ کی جمع ہے اور یہ غیر منصرف ہے کہ اس میں دو سبب وصف اور عدل پائے جاتے ہیں۔ یہ "الاُخر" سے معدول ہے اور اس سے اُس کا معرفہ لانا ضروری نہیں کیونکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ قواعد کی رُو سے اسے معرفہ ہونا چاہیے تھا اور معرفہ نہیں لایا گیا اور یہ بھی نہیں کہ وہ پہلے ہی معرفہ کے معنیٰ میں ہو یا پھر اُخَر آخَرُ مِنْ سے معدول ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ "سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے۔

یعنی جو لوگ حق سے مُنہ موڑے ہوئے ہیں مثلاً دین میں (خواہش نفسانی کے تحت) نئی نئی راہیں نکالنے والے بدعت پسند لوگ۔

فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ وہ اُس کے اُسی حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے۔

اور متشابہ آیات کے ظاہری (غیر واضح) معانی یا باطل تاویلات کو شعار

بناتے ہیں۔ (جو حقیقت سے کہیں دور ہوتی ہیں)

ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے۔

وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں اُن کے دین کے متعلق شک پیدا کر کے اور غلط معانی پہنا کر اور محکم و متشابہ کی آپس میں مخالفت دکھا کر اُنھیں فتنہ میں ڈال دیں۔

وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ اور اس کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے۔

یعنی وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اُن آیات کو اپنی خواہشات کے مطابق معانی دے سکیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل کی کجی والا یہ دونوں مقصد رکھتا ہو یعنی فتنہ میں ڈالنا اور غلط معانی پہنانا۔ یا یہ کہ یکے بعد دیگرے دونوں اس کے مقصود ہوں (نہ بیک وقت) اور پہلا عناد والے کے مناسب حال ہے اور دوسرا جاہل کے موافق۔

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ حالانکہ اُن کا (صحیح) مطلب کوئی نہیں جانتا۔

وہ تأویل جس پر اس کا محمول کرنا مقصود ہے۔

إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ بجز حق تعالیٰ کے اور جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار (اور فہیم) ہیں۔

(راسخون فی العلم سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے علم و عمل میں پختگی پائی ہے اور وہ ثابت قدم ہیں۔ جو لوگ الا اللہ پر وقف کرتے ہیں ان کے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہو گی کہ بعض باتوں کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہے جیسے دنیا کی عمر قیامت کب ہو گی؟ خواص الاعداد جیسے زبانیہ کی تعداد وغیرہ۔ یا ایسے امور جن کے بارے میں قطعی دلیل موجود ہو کہ ان کا ظاہر مراد نہیں ہو سکتا اور ظاہر الفاظ اس کے اصل مدلول پر دلالت نہ کریں)

يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں۔

یہ جملہ مستانفہ ہے اور الراسخون فی العلم سے حال واقع ہوا ہے۔ یا حال کی وضاحت کرنے والا ہے، یا خبر ہے بلشرطیکہ الراسخون کو مبتدأ قرار دیا جائے۔

کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (یہ) سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔

یعنی محکم اور متشابہ دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔

وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہلِ عقل ہیں۔

راسخین کی جودتِ ذہن اور حسنِ نظر کی مدح ہے اور ان کی سعی و استعداد کی طرف اشارہ ہے، جو وہ متشابہات کی تاویل کے لیے کرتے ہیں۔ اور عقل کو حسیات کی طمع سازیوں سے پاک کرتے ہیں۔

آیت کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ اس میں علم و تربیت سے روح کی تکمیل و تزئین کا ذکر ہے اور آیہ ماسبق میں جسم کی تصویر و تسویہ کا ذکر تھا۔ یا خدا تعالیٰ کے قول کلمۃٌ اَلْقَاھَا اِلٰی مریم و روحٌ مِّنْہُ سے ابنیّتِ مسیح کا جواز پیدا کرنے والے نصاریٰ کا جواب دیا گیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس کا کوئی باپ نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، لہٰذا وہی اس کا باپ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو جنین کو جیسے چاہے شکل و صورت دیتا ہے خواہ وہ باپ کے نطفہ سے ہو یا نہ ہو (اس لیے مسیح کے انسانی باپ نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا اس کا باپ ہے) اُس نے تو اسے رحمِ مادر میں صورت عطا کی ہے اور مصوِّر مصوَّر کا باپ نہیں ہوا کرتا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کیجیے۔

یہ راسخین کا قول ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور معنٰی یہ ہے کہ اے پروردگار ہمارے دل حق سے موڑ کر متشابہات کی ایسی تاویل پر نہ لگا دے جو تیری مرضی کے خلاف ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: قلب ابن آدم

بین اصبعین من اصابع الرحمان إن شاء أقامه علی الحق وان شاء ازاغہٗ عنہ۔ (۳) یا یہ دعا کی گئی ہے کہ ہمیں ایسی آزمائشوں میں نہ ڈال جن میں پڑکر ہمارے دل ٹیڑھے ہو جائیں۔

بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا بعد اس کے کہ آپ ہمیں ہدایت کر چکے ہیں۔

یعنی حق کی طرف راہنمائی کے بعد یا محکم و متشابہ ہر دو پر ایمان لانے کے بعد۔ " بَعْدَ " ظرفیت کی بنا، پر منصوب ہے اور " إِذْ " جر کے مقام میں ہے کیونکہ یہ " بعد " کا مضاف الیہ ہے۔ اور " إِذْ " کو " إِنْ " کے معنیٰ میں بھی لیا گیا ہے۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اور ہمیں اپنے پاس سے رحمتِ (خاصہ) عطا فرمائیے۔

(ایسی رحمت) جو ہمیں تیرے قریب کرے۔ یا۲ یہ کہ حق پر ثابت قدم رہنے کی توفیق ہو۔ یا۳ یہ کہ گناہوں کی مغفرت ہو۔

إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔

(ہر امر کے) جو آپ سے مانگا جائے۔ وہّاب کے لفظ میں دلیل ہے کہ ہدایت اور ضلالت دونوں خدا تعالیٰ سے ہی ملتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ انسان کو جن انعامات سے نوازتا ہے وہ اس کا فضل ہی ہے ورنہ خدا تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں ہے۔

رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ اے ہمارے پروردگار آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدانِ محشر میں) جمع کرنے والے ہیں اُس دن میں۔

حساب۱ کے لیے یا۲ جزا، سزا دینے کے لیے جمع کریں گے۔

لَا رَيْبَ فِيهِ جس میں ذرا شک نہیں

یعنی اُس دن کے وقوع میں کوئی شک نہیں اور جو حشر اور جزا نافذ ہو گی

(اُس میں بھی شک نہیں)۔ اس میں انسان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اس کے دونوں مطالبات (طلبِ رحمت اور استقامتِ قلب) کی غرض کا تعلق آخرۃ ہی سے ہے اور وہی اس کا مقصد و مآل ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (اور) بلا شبہ اللہ تعالیٰ خلاف کرتے نہیں وعدے کو۔

کیونکہ اُلوہیت وعدہ خلافی کے منافی ہے۔ یومِ حساب کا احساس دلانے اور (یومِ موعود کی) عظمت ظاہر کرنے کے لیے خطاب کو یہ رنگ دیا گیا ہے۔ اور وعیدیہ گروہ نے اس سے یہ دلیل پکڑی کہ فاسقین کو ضرور عذاب دیا جائے گا۔ مگر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ فاسقین کے بارے میں وعید کا تحقق عدمِ عفو سے لازم آتا ہے۔ جیسا کہ وعید عدمِ توبہ سے مشروط ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۱۷ بالیقین جو لوگ کفر کرتے ہیں۔

یہاں ۱ تمام کافر مراد ہیں یا ۲ خاص طور پر وفدِ نجران یا ۳ یہود یا ۴ مشرکینِ عرب۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ہرگز اُن کے کام نہیں آسکتے اُن کے مال (و دولت) اور نہ اُن کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی۔

یعنی اُن کے اموال و اولاد اُن کو ۱ خدا کی رحمت سے یا ۲ اُس کی اطاعت سے مستغنی نہیں کر سکتے کہ یہ مال و اولاد اُس کا بدل نہیں ہیں یا ۳ خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکتے۔

وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ اور ایسے لوگ جہنم کا سوختہ ہوں گے۔

۱ جہنم کا ایندھن۔ اور اِسے "و" کے ضمہ سے (وُقود) بھی پڑھا گیا۔ اور اس صورت میں اس کے معنی (اَہلِ وَقود) جلنے والے ہوگا۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ جیسا معاملہ تھا فرعون والوں کا۔

اپنے ماقبل (لن تغنی) سے متصل ہے۔ یعنی اُن کے مال و اولاد اُن کے کام نہیں آئیں گے جس طرح "آلِ فرعون" کے کام نہ آئے۔ یا اُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ سے متعلق ہے۔ یعنی آگ اُن کو بھی اسی طرح جلائے گی جس طرح "آلِ فرعون کو۔ یا جملہ مستأنفہ ہے اور محلاً مرفوع ہے اور تقدیر اس کی یوں ہے "دَأْبُ هٰٓؤُلَاءِ كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ فِي الْكُفْرِ وَالْعَذَابِ" دأب مصدر ہے۔ دَابَ فِي الْعَمَلِ کا معنیٰ ہے كَدَحَ فِيْهِ (یعنی جدّ وجہد کی) اور یہ (دأب) شان (حالت) کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ان سے پہلے والے (کافر) لوگوں کا معاملہ۔

آلِ فرعون پر عطف ہے یا جملہ مستأنفہ ہے۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر دارو گیر فرمائی اُن کے گناہوں کے سبب۔

یہ حال واقع ہوا ہے اور "قَدْ" مقدر ہے یا جملہ مستأنفہ ہے جو اُن کے حال کی تفسیر ہے یا خبر ہے بشرطیکہ جملہ "وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" سے شروع کیا جائے (یعنی اُسے مبتدا قرار دیا جائے)

وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔

کفار کو مواخذۂ الٰہی سے ڈرانے اور زیادہ خوفزدہ کرنے کے لئے یوں فرمایا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ

آپ اِن کفر کرنے والوں سے فرما دیجیے کہ عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کیے جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے

یعنی[1] مشرکینِ مکہ سے کہہ دو کہ وہ یوم بدر میں مغلوب ہوں گے۔ یا[2] یہودِ مدینہ سے خطاب ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے یہود کو غزوۂ بدر کے بعد سوق بنی قینقاع میں جمع کرکے ڈرایا کہ اُن کی حالت بھی ویسی ہو سکتی ہے جو قریش مکہ کی بدر کے موقع پر ہوئی ہے۔ اس پر اُنھوں نے جواب دیا: "لَا یُغَرَّنَّکَ أَنَّکَ أَصَبْتَ أَغْمَارًا لَا عِلْمَ لَہُمْ بِالْحَرْبِ لَئِنْ قَاتَلْتَنَا لَعَلِمْتَ إِنَّا نَحْنُ النَّاسُ" اس پر یہ آیۃ نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے قریظہ کے قتل، بنی نضیر کی جلاوطنی، خیبر کی فتح اور باقی یہود کو جزیہ کی ذلّت دکھا کر یہ وعدہ پورا کردیا اور یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہے۔

حمزہ اور کسائی نے "سَیُغْلَبُوْنَ وَ یُحْشَرُوْنَ" پڑھا ہے گویا بالواسطہ طور پر (INDIRCET NARRATION) اُنھیں دھمکی دی گئی ہے۔

وَ بِئْسَ الْمِهَادُ اور وہ (جہنم) ہے بُرا ٹھکانا۔

اُن[1] کفار کو جو کہا گیا ہے اُس قول کے ساتھ شامل ہے (یعنی "الی جھنّم بئس المھاد") یا[2] مستانف جملہ ہے اور اس کی تقدیر "بئس المھاد جھنّم" ہے یا[3] "مِھَاد" سے مراد ہے "ما مَھّدُوْہُ لأنفسِہِم" کہ (جو کچھ اُنھوں نے اپنے لیے تیار کیا) وہ بُرا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ بے شک تمہارے لیے بڑا نمونہ ہے۔

اس میں خطاب قریش سے ہے یا[1] یہود سے ہے یا[2] مومنوں سے ہی ہے۔

فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا دو گروہوں (کے واقعہ) میں جو کہ باہم ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تھے

جنگِ بدر کے دن۔

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ

ایک گروہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا تھا (یعنی مسلمان) اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے یہ کافر اپنے کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصہ (زیادہ) ہیں۔

(۱) یعنی مشرکوں کو مومن اپنی تعداد سے یا ان کی ذاتی تعداد سے دُگنے نظر آتے تھے۔ کفار کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمانوں کی تعداد کچھ اوپر تین سو تھی۔ یہ اس لیے کہ پہلے تھوڑے نظر آئے تبھی حملہ کرنے کی جرأت کی، لیکن لڑائی شروع ہو جانے پر اُن کو مومن دُگنے نظر آئے اور وہ مرعوب ہو گئے، مومنین کو خدا تعالیٰ کی تائید حاصل ہوئی اور ان کو شکست ہوئی (۲) (ب) مومن مشرکوں کو اپنے سے دُگنا سمجھتے تھے، حالانکہ وہ تگنے تھے، تاکہ ان کی ہمتیں مضبوط ہوں اور اُن کو خدا تعالیٰ کے وعدہ "فان یکن منکم مأة صابرة یغلبوا مأتین" پر پورا یقین ہو اور اختلاف قرأت اس معنیٰ کی تائید 'یعقوب' اور 'نافع' کی قرأت سے بھی ہوتی ہے جنہوں نے (۱) "تَرَوْنَهُمْ" پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں مجہول بھی پڑھے گئے ہیں، جیسے (۲) "يُرَوْنَهُمْ" - (۳) "تُرَوْنَهُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اُن کو دکھاتا تھا یا تمہیں دکھاتا تھا۔ اور "فئة" (۱) جر بھی پڑھا گیا اس صورت میں کہ یہ "فئتین" سے بدل ہوگا اور (۲) اسے منصوب بھی پڑھا گیا اختصاص کی بنا پر یا یہ "اِلْتَقَتَا" کے فاعل سے حال واقع ہوا ہے۔

رَأْيَ الْعَيْنِ کھلی آنکھوں دیکھنا

یعنی یہ تو سامنے آنکھوں دیکھی جانے والی ظاہر بات تھی۔

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ اور اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جسے چاہتے ہیں قوت دے دیتے ہیں۔

جیسا کہ اُس نے بدر والوں کی تائید و نصرت فرمائی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ (سو) بلا شک اس میں۔

[۱] تعداد کو اصل سے کم و بیش دکھانے میں یا [۲] بے سرو سامان قلیل تعداد کو ہتھیاروں سے لیس کثیر تعداد پر غالب کرنے میں یا [۳] خود یہ واقعہ ہی آیت ہے اور [۴] اس کا بھی احتمال ہے کہ واقعۃً (ایسا تقلیل و تکثیر ہوا یا) فتح وغیرہ ایک آیت ہو جس کی آنحضور علیہ السلام خبر دے چکے تھے۔

لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ بڑی عبرت ہے (دانش و بینش والے لوگوں کو۔
[۱] صاحب بصیرت لوگوں کے لیے یا [۲] جنگ بدر میں جن لوگوں نے فریقین کو دیکھا تھا اُن کے لیے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی۔

شہوات سے مراد مشتہیات (یعنی پسندیدہ چیزیں) ہیں۔ اُن کا نام شہوات مبالغہ کی بناء پر رکھا گیا اور یہ اشارہ کرنے کے لیے کہ وہ اُن کی محبت میں اس قدر منہمک ہو گئے جیسے شہوت محبوب ہوتی ہے، جیسے فرمایا اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ (کہ میں نے ان سے اس طرح محبت کی جیسے نیک باتوں سے کی جاتی ہے) اور [۱] مُزَیِّن (زینت دینے والا) خود اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ وہ افعال اور خواہشات کا خالق ہے اور ہو سکتا ہے کہ [۱] اس نے زینت ابتلاء کے لیے رکھی ہو یا [۲] اس لیے زینت رکھی ہو کہ اُن کا صحیح اور خدائی مرضی کے مطابق استعمال سعادۃِ اُخرویہ کا باعث ہو۔ یا [۳] اس لیے کہ یہ اُمور انسانی زندگی اور بقائے نوع کے لیے لازمی ہیں۔

(ب) یہ بھی کہا گیا ہے کہ مزیّن شیطان ہے کیونکہ آیت میں مذمت کا پہلو پایا جاتا ہے اور جبائی نے (مزیّن اشیاء و اُمور میں) حلال و حرام کا فرق بیان کیا ہے کہ جو شہوات مباح ہیں اُن کا مزیّن کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور جو شہوات حرام ہیں اُن کا

شیطان لعین ہے۔

مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط

(مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی۔

یہ شہوات کا بیان (یعنی تفصیل) ہے اور قنطار سے مال کثیر[۱] یا[۲] ایک لاکھ دینار یا[۳] بیل کی کھال بھر مال مراد ہے۔ اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس کا وزن 'فِعْلَال' ہے یا 'فِنْعَال' اور المقنطرة قنطار سے ہی ماخوذ ہے تاکید کے لئے آیا ہے جیسے کہا جاتا ہے "بَدْرَةٌ مُبَدَّرَةٌ"۔ 'المسوّمة' کا معنی ہے [۱] 'المعلّمة' یعنی علامت ونشان زدہ، یہ المتومة سے ہے جس کا معنی علامت ہے یا[۲] اس کا معنی ہے 'المرعيّة' (پالا ہوا) جیسے کہا جاتا ہے أَسَامَ الدَّابَّةَ وَسَوَّمَهَا یا[۳] المسوّمہ کا معنی ہے المُطَهَّمَة (خوب پلے ہوئے موٹے تازے گھوڑے تام الخلقہ ہاتھ پاؤں کے مضبوط، صورت وشکل کے عمدہ۔ طہم: موٹا ہونا) الأنعام اونٹ، گائے، بیل اور بھیڑ، بکری سب مواشی کو عام ہے۔

ذَالِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دُنیوی زندگانی کی۔

ذالک میں مذکورہ چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

یعنی (مآب) مرجع (لوٹنے کی جگہ)۔ اس میں اس امر کی (تحریص و) ترغیب ہے کہ ان فانی اور ناقص شہوات کے بدلے ابدی اور حقیقی لذات حاصل کرنے کی

کوشش کرنا چاہیے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ آپ فرما دیجیے کیا میں تمہیں ایسی چیز بتلا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان چیزوں سے۔

اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں کا ثواب لذّاتِ دُنیوی سے بہتر ہے۔

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (سو سنو!) ایسے لوگوں کے لیے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں اُن کے مالکِ (حقیقی) کے پاس ایسے ایسے باغ ہیں جن کے پائیں میں نہریں جاری ہیں اُن میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

یہ جملہ مستانفہ ہے جس میں "خیر" کی وضاحت کی گئی ہے، یہ بھی جائز ہے کہ (لِلَّذِيْنَ' کا) لام 'خیر' سے متعلق قرار دیا جائے۔ اور "جَنّٰتٌ" کا رفع خبر ہونے کی وجہ سے ہو یعنی "هُوَ جَنّٰتٌ" اس کی تائید اُس قرأت سے بھی ہوتی ہے جو 'جَنّٰتٍ' کی جرّ 'خیر' کے بدل ہونے کی بناء پر لاتے ہیں۔

وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور (اُن کے لیے) ایسی بیبیاں ہیں جو صاف ستھری کی ہوئی ہیں۔

27734

یعنی اُن گندگیوں سے پاک ہیں جو عورت میں قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہیں۔

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اور (اُن کے لیے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

ابو بکر کی روایت کے مطابق عاصم نے تمام قرآن کریم میں رُضوان پڑھا ہے سوائے 'مائدہ' کی آیۃ "رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ" کے، اور یہ دونوں (رِضوان کی) لُغتیں (بولیاں) ہیں۔

وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ اور اللہ تعالیٰ خُوب دیکھتے (بھالتے) ہیں بندوں کو۔

یعنی[۱] "بصیرٌ باعمالھم" جس کی بناء پر نیکی کرنے والے کو اچھا بدلہ اور برائی کرنے والے کو سزا دی جائے گی یا[۲] "بصیر باحوال الذین اتقوا" الف لام استغراق یا عہد کا ہے۔ اسی لیے اُن کے لیے باغاتِ بہشت تیّار کیے ہیں۔ گویا ان آیات میں انعامات خداوندی کے تین درجے بتائے ہیں:

۱۔ ادنیٰ درجہ متاعِ دنیا۔

۲۔ متوسط درجہ جنت اور اس کی نعمتیں۔

۳۔ اعلیٰ درجہ خوشنودی اللہ تعالیٰ کی اور فرمایا و رضوان من اللہ اکبر۔

اَلَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (یہ) ایسے لوگ (ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجیے اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لیجیے۔

[۱] یہ "متقین" کی صفت ہے لہذا مجرور ہے یا[۲] "عباد" کی صفت ہے یا[۳] منصوب بتقدیر أمدح ہے یا[۴] مرفوع ہے (مبتدا محذوف کی خبر ہو کر) اس آیت سے یہ دلیل ملتی ہے کہ محض ایمان مغفرت یا استعدادِ مغفرت کے لیے کافی ہے۔

اَلصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡمُنۡفِقِیۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ (اور وہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور راستباز ہیں اور (اللہ کے سامنے) عاجزی کرنے والے ہیں اور (مال) خرچ کرنے والے ہیں اور اخیر شب میں اٹھ اٹھ کر گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

اس آیت میں سالک کے مقامات کو انتہائی حسین ترتیب سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ سالک کا خدا تعالیٰ سے معاملہ توسّل[۱] ہوتا ہے یا[۲] طلب۔ پھر توسّل یا[۱] تو نفس کے ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ہے اُسے رذائل سے باز رکھنا اور فضائل پر قائم رہنا۔ اور

صبر میں یہ دونوں صفات آگئیں۔ یا (توسل) بدن کے ذریعہ ہوتا ہے اور وہ یا قولی ہوگا جو سچ بولنا ہے اور یا فعلی ہوگا جو قنوت و عاجزی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ طاعت کا لازمہ ہے۔ تیسری صورت توسل کی مال کے ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بھلائی کے مقامات پر خرچ کیا جائے۔ باقی رہا طلب تو وہ بخشش مانگنا ہے کیونکہ مغفرت ہی تمام مقاصد میں ایک مقصد عظیم ہے بلکہ تمام مقاصد کو جامع ہے۔

مقامات السالک کا شجرہ یہ ہے :

معاملۃ مع اللہ
- توسل
  - نفس
    - منع عن الرذائل
    - حبس علی الفضائل
  - بدن
    - قولی (الصدق)
    - فعلی (القنوت)
  - مال
    - انفاق فی سُبُل الخیر
- طلب
  - استغفار (اعظم المطالب بل الجامع لہا)
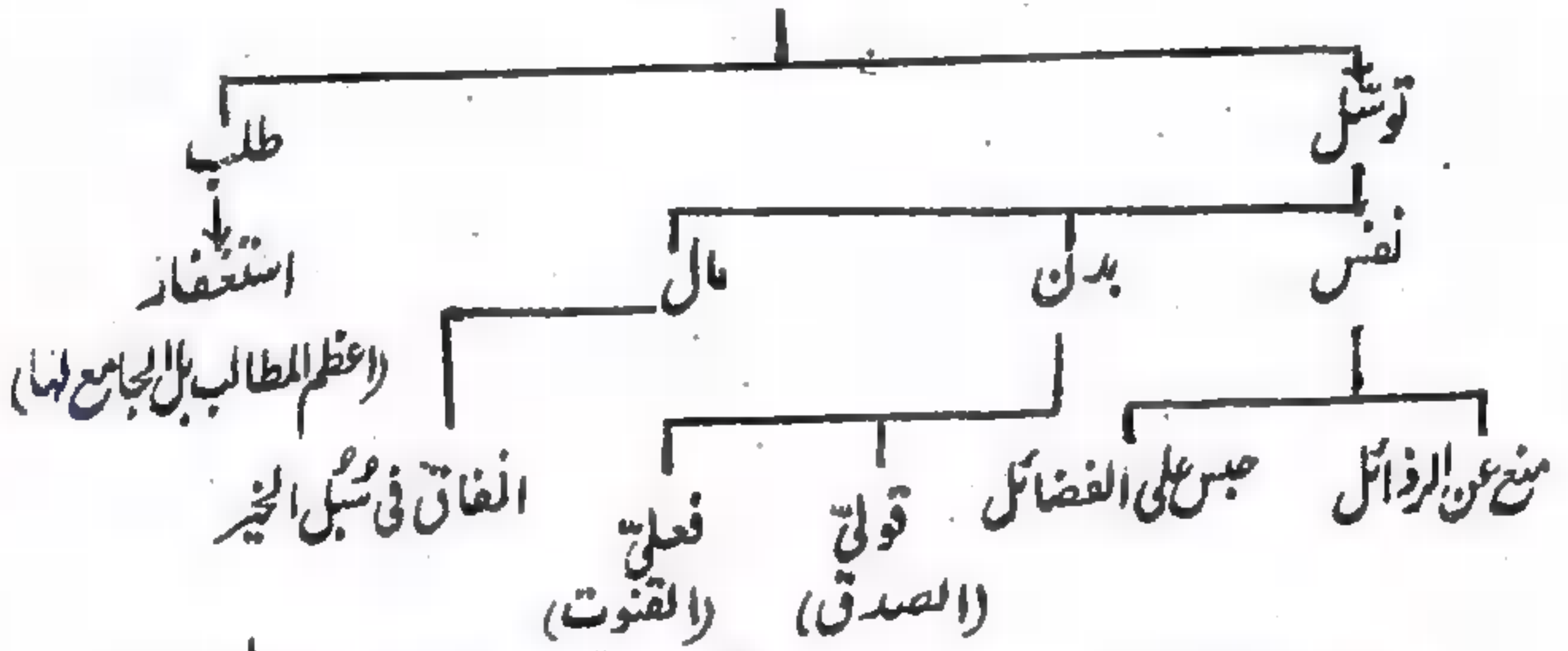
ان تمام مقامات کے درمیان 'واؤ' لائی گئی جس سے یہ مقصود ہے کہ ان تمام اوصاف میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقل وصف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس لئے کہ ایک سالک ان تمام میں کمال حاصل کرتا ہے۔ یا یہ کہ مختلف سالکین مختلف مقامات میں ممتاز درجہ کے مالک ہوئے (یعنی کسی نے صبر میں کمال پیدا کیا تو دوسرے نے صدق میں، پھر ایک نے قنوت کا مقام طے کیا تو اور کسی نے اِنفاق کا مقام پایا اور اسی طرح کسی نے درجہ استغفار میں دوسروں سے امتیاز حاصل کیا) اس طرح ہر ایک موصوف الگ ہے۔

اور "اسحار" کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت دُعا قبولیت کے زیادہ

قریب ہوتی ہے کیونکہ اُس وقت عبادت نفس پر زیادہ گراں گزرتی ہے اور طبیعت زیادہ صاف ہوتی ہے اور خاطر جمع ہوتی ہے خاص طور پر تہجد خوانوں کے لیے (یہ وقت نہایت مبارک ہوتا ہے) ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ لوگ سحر تک نمازیں پڑھا کرتے تھے پھر اُس کے بعد استغفار کرتے اور (اپنے پروردگار سے) دعائیں مانگتے۔ (گویا 'اسحار' کے ذکر سے اُن کے 'قیام اللّیل' کی طرف اشارہ ہے)۔

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ گواہی دی ہے اللہ نے اس کی کہ بجز اُس کی ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔

اُس نے اپنی وحدانیت کے لیے واضح دلائل عقلیہ و سمعیہ دیے اور ایسی آیات نازل فرمائیں جو اُس کی توحید پر دالّ ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ اور فرشتوں نے بھی۔

اور ان کی شہادت اُن کے اقرار کے ذریعہ ہے۔

وَأُولُوا الْعِلْمِ اور اہلِ علم نے بھی۔

علماء کی شہادت اس پر ایمان لانا اور اس پر دلائل دینا ہے۔ گویا ان کا بیان اور انکشاف دلائل ایک گواہ کی گواہی ہے۔

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ اور معبود بھی وہ اِس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں

عدل قائم کرنے والے ہیں اس کی اقسام میں اور احکام میں۔ قَآئِمًا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ لفظ 'اللّٰہُ' سے حال ہے (شہد اللہ قائمًا بالقسط) اور حال کو ذوالحال سے فاصلے سے لانا ایسے مواقع پر جائز ہے کہ یہاں التباس نہیں لیکن "جاء زیدٌ وعمروٌ راکبًا" زید کا حال ہو، التباس کی وجہ سے جائز نہیں۔ حال اور ذوالحال کے بالفصل آنے کی مثال یہ بھی

ہے: 'و وھبنا لہٗ إسحاقَ ویعقوبَ "نافلۃً"، یا[۲] یہ ھُوَ کا حال ہے (کہ یوں پڑھیں گے: شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو قائما بالقسط) اُس[۱] صورت میں معنیٔ جملہ اس میں عامل قرار پائے گا یعنی 'تفرّد قائماً' وہ تنہا ہی قائم بالقسط ہے۔ یا[۲] حالِ موکدہ ہونے کی وجہ سے 'أحقہ' مقدر مانیں تو یوں ہوگا: أحِقّہٗ قَائِمًا بِالْقِسْطِ (میں تنہا اُسی کو قائم بالقسط تسلیم کرتا ہوں)۔

(ا) پہلی صورت حال کی تھی (ب) دوسری صورت یہ ہے کہ 'قائماً' منصوب علی المدح ہے (ج) یا تیسری صورت یہ ہے کہ 'قائماً' منفی کی صفت ہے (یعنی لَا اِلٰـہَ قَائِمًا بالقسط) مگر یہ صورت ضعیف ہے، کیونکہ صفت اور موصوف میں اتنا فاصلہ نہیں ہوتا۔

اور بصورتِ صفتِ (لا الٰہ) ہونے کے اور بصورت حال (مِنْ ھُوَ) ہونے کے قائماً بالقسط بھی مشہود بہ میں شامل ہوگا اور اسے 'القائمُ بالقسط' بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں ضمیر 'ھُوَ' سے بدل ہے یا مبتدأ محذوف کی خبر ہے۔

لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اُن کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔

اِسے[۱] تاکید کی خاطر دوبارہ لائے اور[۲] اس لئے بھی کہ دلائل توحید کو پہچاننے کی طرف زیادہ توجہ دی جائے اور[۳] دلائل قائم کرنے کے بعد فیصلہ بھی سُنا دیا جائے اور[۴] اس لئے بھی کہ العزیز الحکیم کو بھی اسی پر مبنی قرار دیا جائے۔

اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

تاکہ معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہی ان دو صفات سے متصف ہے اور چونکہ اُس کی قدرت کا علم اُس کی حکمت کے علم سے مقدّم ہے اس لیے 'العزیز' کو الحکیم سے پہلے بیان کیا۔ یہ اسماء 'ھُوَ'[۱] کا بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں یا[۲] 'شَہِدَ' کے فاعل (اللہ) کی صفت ہونے کی وجہ سے رَفع آیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ یُجَاءُ بِصَاحِبِهَا یَومَ القِیَامَةِ فَیَقُولُ اللّٰهُ تعالیٰ
اِنَّ لِعَبْدِی هٰذَا عِنْدِی عَهْدًا وَّ اَنَا اَحَقُّ مَنْ وَفٰی بِالْعَهْدِ
"اَدْخِلُوْا عَبْدِیَ الْجَنَّةَ" (اس آیۃ کا پڑھنے والا قیامت کے دن لایا
جائے گا پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے اس بندے کا مجھ سے ایک عہد ہے
اور میں سب سے زیادہ ایفائے عہد کرنے والا ہوں، میرے بندے کو جنت میں داخل
کر دو)۔

یہ آیۃ اصولِ دین (سیکھنے اور) جاننے کی فضیلت اور ایسے عُلماء کے شرف
پر دلالت کرتی ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ بلاشبہ دینِ (حق اور مقبول)
اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

یہ جملہ مستأنفہ ہے، پہلے جملہ کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ یعنی کوئی دین سوائے
اسلام کے اللہ تعالیٰ کے ہاں پسند نہیں اور اسلام توحید کو تسلیم کرنے اور شرع
محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کا نام ہے۔ اِعراب کِسائی نے
اَنَّ بالفتح پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ "اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" سے بدل کل
ہے بشرطیکہ اسلام کی تفسیر ایمان یا متعلقات ایمان سے کی جائے۔ اور بدلِ اشتمال
ہوگا جبکہ اسلام کی تفسیر مخصوص شریعت کے طور پر کی جائے۔

اور یہ قرأت بھی ہے کہ (اوپر) اَنَّهُ لَا اِلٰهَ میں اِنَّهُ مکسور پڑھا
جائے اور اَنَّ مفتوح یعنی وقوعِ فعل اِنَّهُ پر نہیں بلکہ اَنَّ پر ہوا۔ اور
درمیان میں تمام جملہ معترضہ کے طور پر آیا۔ یا فعل شَهِدَ کا اِجراء "قَالَ تَارَةً
وَعَلِمَ اُخْرٰی" یعنی پہلی شہادت قولی ہے اور دوسری علمی کیونکہ شَهِدَ
دونوں معنی پر حاوی ہے۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اور اہلِ کتاب نے جو اختلاف کیا (کہ اسلام کو باطل کہا)

یعنی یہود و نصاریٰ یا مطلق وہ لوگ جن کے پاس پہلے صحائف آسمانی آئے [۱] اُنہوں نے دینِ اسلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ بعض نے کہا اسلام حق ہے، بعض نے اُسے صرف عربوں کے لیے مخصوص قرار دیا اور بعض نے بالکل انکار کر دیا۔ یا [۲] اُنہوں نے توحید کے بارے میں اختلاف کیا۔ نصاریٰ نے تثلیث کو اپنایا اور اور یہود نے کہا عُزَیر (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ صرف یہود مُراد ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد اختلاف کیا اور نصاریٰ بھی مراد لیے جاتے ہیں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختلاف کیا۔

اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ تو ایسی حالت کے بعد کہ اُن کو دلیل پہنچ چکی تھی۔

یعنی حقیقتُ الامر معلوم کر لینے اور آیات اور (واضح) دلائل کے ساتھ اس اختلاف (کا حل) جان لینے کے بعد۔

بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ محض ایک دوسرے سے بڑھنے کے سبب سے۔

یعنی آپس میں حسد کی وجہ سے اور سرداری حاصل کرنے کی غرض سے ورنہ اُنہیں کوئی اشتباہ نہ رہا تھا اور کوئی بات اُن سے چھپی نہ رہی تھی۔ (بغیاً مفعول لہٗ ہو کر منصوب ہے اور بینھم ظرف مستقر ہو کر بغیاً کی صفت ہے)

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اُس کا حساب لینے والے ہیں۔

مذکورہ لوگوں میں سے جنہوں نے اسلام کا انکار کیا اس آیۃ میں اُن کے لیے

وعید ہے۔

فَإِنْ حَاجُّوكَ پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے حجتیں نکالیں۔

یعنی دین کے بارے میں بحث کریں یا تیرے حجت پوری کر دینے کے بعد بھی تجھ سے مباحثہ کریں۔

فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ تو آپ فرما دیجیے کہ (تم مانو یا نہ مانو) میں تو اپنا رُخ خاص اللہ کی طرف کر چکا۔

یعنی میں نے اپنے نفس اور جملہ قویٰ کو خدا تعالیٰ کے لیے خالصۃً مخصوص کر دیا ہے اور کسی غیر اللہ کو اس میں شریک نہیں کروں گا۔ یہی وہ صحیح دین ہے جس کی حجت قائم ہے اور جس کے لیے حق کے نشانات اور انبیاء علیہم السلام نے دعوت دی ہے ــــــ 'نفس' کا مفہوم بیان کرنے کے لیے 'وَجْہ' کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ چہرہ ظاہری اعضا میں سے اشرف اور قویٰ و حواس کا مظہر ہے۔

وَمَنِ اتَّبَعَنِ اور جو جو میرے پیرو تھے وہ بھی۔

'اسلمت' کی ضمیر بارز 'ت' پر عطف ہے اور فصل کی وجہ سے عطف جائز بھی ہو گیا۔ یا مفعول معہ ہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ اور کہیے اہلِ کتاب سے اور مشرکین عرب سے۔

اُمّیین جن کے پاس کتاب نہیں آئی جیسے مشرکینِ عرب۔

أَأَسْلَمْتُمْ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟

جس طرح میں ایمان لایا ہوں جبکہ میں نے بدلائل تمہارے سامنے اس کی وضاحت کی ہے۔ یا ابھی اپنے کفر ہی پر قائم ہو؟ لفظوں میں تو یہ استفہام ہے مگر معنی میں امر ہے۔ اس کی نظیر "فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ" ہے اور اس میں

اُن کی کند ذہنی کی طرف ۔۔ یا معاندت کی طرف اشارہ کرکے عار دلانا مقصود ہے۔
فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو
وہ لوگ بھی راہ پر آ جاویں گے۔

اور اس طرح گویا اُنہوں نے اپنے آپ کو نفع پہنچایا کہ گمراہی سے بچ گئے۔
وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ اور اگر وہ لوگ روگردانی
رکھیں تو آپ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔

یعنی پھر جانے کی صورت میں آپ کو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جبکہ
آپ کا فرض اُن تک پیغام پہنچانا تھا اور آپ نے یہ فرض ادا کر دیا۔
وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ اور اللہ تعالیٰ خود دیکھ (اور سمجھ) لیں گے
بندوں کو۔

وعدہ اور وعید دونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔
إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ
النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ بے شک جو لوگ کفر کرتے
ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق اور قتل کرتے
ہیں ایسے شخصوں کو جو (افعال و اخلاق کے) اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں سو ایسے
لوگوں کو خبر سنا دیجیے ایک سزائے دردناک کی۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہمعصر اہل کتاب مراد ہیں جن کے
آبا و اجداد نے انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کو قتل کیا اور یہ اُس فعل سے
خوش اور راضی تھے ۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دوسرے
مؤمنین کو قتل کرنا چاہا لیکن خدا تعالیٰ نے اُنہیں محفوظ رکھا۔ اس قسم کا بیان

سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بغیر حقّ یعنی اُن کے اعتقاد میں بھی ناحق ہی تھا ورنہ انبیاء کو قتل کرنا ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے۔ حمزہ صاحب نے یقتلون الذین کی جگہ "یُقَاتِلُوْنَ الَّذِیْنَ" پڑھا ہے۔ سیبویہ نے 'اِنَّ' کی خبر پر 'لیتَ' اور 'لعلّ' کی خبر کی طرح 'ف' کا داخل کرنا جائز نہیں سمجھا، اس لیے اُس نے فبشرهم بعذاب الیم کو جملہ معترضہ اور اگلی آیت کو خبر قرار دیا ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے سب اعمال (صالحہ) غارت ہوگئے دنیا میں اور آخرت میں۔

اور یہ اسی طرح درست ہے جس طرح یہ کہنا درست ہے زَیْدٌ فَاَفْهَمْ رَجُلٌ صَالِحٌ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اِنَّ — "لیت اور لعلّ" کی طرح مبتدا کے معانی نہیں بدلتا۔ یعنی ثبوتِ خبر علی المبتدا بخلاف لیت و لعلّ کے۔

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ اور (سزا کے وقت) اُن کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

جو اُن سے عذاب کو دور کرسکے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ (اے محمدؐ) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا۔

کتاب سے توراۃ مراد ہے یا جنسِ کتُبِ سماویہ۔ 'مِنْ' تبعیض یا تفسیر کے لیے ہے اور 'نصیب' کو تعظیم کے لیے نکرہ لایا گیا ہے یا تحقیر کے لیے۔

يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اور اسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے اُن کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کردے۔

یہاں داعی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں اور کتاب سے مراد

قرآن مجید یا توراۃ ہے۔ روایت ہے کہ حضور علیہ السلام اُن کی درسگاہ میں گئے تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ سے پوچھا: عَلٰی اَیِّ دِیْنٍ اَنْتَ؟ آپ نے فرمایا: عَلٰی دِیْنِ اِبْرَاھِیْمَ۔ اُنہوں نے کہا: ابراہیم (علیہ السلام) تو یہودی تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا: "توراۃ لاؤ، یہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔" لیکن اُنہوں نے انکار کیا تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت رجم کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ الاختلاف خبر کان لِیَحْکُمَ مجہول لِیُحْکَمَ پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں یہود کا اندرونی اختلاف مراد ہوگا۔ اس میں دلیل ہے کہ اصول میں اَدلّہ سمعیہ حُجّۃ ہوتی ہیں۔

ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ پھر (بھی) اُن میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں۔

یُدْعَوْنَ پر عطف ڈال کر اُن کے پھر جانے کو بعید از عقل قرار دیا ہے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ کتاب کی طرف رجوع واجب ہے۔

وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ بے رُخی کرتے ہوئے۔

یعنی یہ ایسے لوگ ہیں کہ اعراض اُن کی عادت میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ جُملہ "فَرِیْقٌ" سے حال واقع ہوا ہے اور اُن کے اس صفت سے مخصوص ہونے کی وجہ سے لایا گیا ہے۔

ذٰلِکَ (اور) یہ رویّہ۔

اُن کے اعراض اور تولّی کی طرف اشارہ ہے۔

بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی (پھر مغفرت ہو جاوے گی)۔

یعنی اس لئے کہ اُنہوں نے اپنے متعلق عذابِ الٰہی کے معاملہ کو آسان سمجھ

رکھا ہے بسبب اپنے غلط عقیدے اور فضول طمع کے۔

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ اور اُن کو دھوکا میں ڈال رکھا ہے اُن کی تراشی ہوئی باتوں نے۔

افترا سے مراد اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ انھیں صرف چند ہی دن آگ چھوئے گی۔ یا اُن کے آباء میں جو انبیاء گزرے ہیں وہ سفارش کر کے چھڑا لیں گے۔ یا یہ افترا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ اُن کی اولاد کو صرف قسم پوری کرنے کے لیے عذاب دیا جائے گا۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ سو اُن کا کیا (برا) حال ہوگا جبکہ ہم اُن کو اُس تاریخ میں جمع کر لیں گے جس (کے آنے) میں ذرا شبہ نہیں۔

یہ قول آخرت میں یہود سے کیے جانے والے سلوک کی عظمت و ہولناکی بیان کرنے کے لیے ہے اور ان کے قول "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ" کی تکذیب کے لیے ہے۔ روایت ہے کہ قیامت کے دن کفار کے جھنڈوں میں سے یہود کا جھنڈا پہلے بلند کیا جائے گا تو سب کے سامنے اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے گا اور پھر دوزخ میں ڈالنے کا حکم فرمائے گا۔

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ اور (اُس تاریخ میں) پورا پورا بدلہ مل جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اُس نے (دنیا میں) کیا تھا۔

یعنی اُن کے اعمال کی جزا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عبادت کسی صورت بھی ضائع نہ کی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ مومن جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا کیونکہ اُس کے ایمان و عمل کی جزا دوزخ میں نہیں ہو سکتی اور اِس (دخولِ نار) سے پہلے بھی نہ ہوئی تھی لہٰذا وہ جہنم سے نجات کے بعد ہی ہو گی۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ اور ان شخصوں پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

ضمیر "ھُمۡ" عمومی معنیٰ میں ہے کہ اُس کا معنیٰ مطلقاً تمام انسان ہیں۔ یعنی یہ ضمیر معنیٰ کے لحاظ سے "کلّ نفسٍ" کی طرف راجع ہے۔

قُلِ اللّٰھُمَّ (اے محمدؐ) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہیے کہ اے اللہ!

اَللّٰھم کی میم 'یا' ندا کے بدلے میں ہے اسی لیے "م" اور "یا" جمع نہیں ہوتے۔ اور اس 'م' کا داخل ہونا صرف 'اللّٰہ' کے اسم سے مختص ہے جس طرح کہ لفظ 'اللّٰہ' کے اور بھی خصائص ہیں۔ مثلاً اس پر لامِ تعریف کے باوجود 'یا' داخل ہوتا ہے اور اس پر ہمزہ باقی رکھا جاتا ہے اور اس پر تاءِ قسم بھی داخل ہوتی ہے (جبکہ اور کہیں نہیں ہوتی)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں "یَا اَللّٰہُ اُمَّنَا بِخَیۡرٍ" تھا، تخفیف کی خاطر حرفِ ندا، متعلقاتِ فعل اور ہمزہ سب حذف کر دیے۔

مٰلِکَ الۡمُلۡکِ مالک تمام ملک کے۔

خدا تعالیٰ ایک مالک کی حیثیت سے اشیاء پر تصرف رکھتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک یہ دوسری ندا ہے اور اس پر سے حرفِ ندا کو حذف کر دیا ہے اُس کی رائے میں اللّٰھُمَّ کی 'م' وصفیہ (صفت موصوف) سے مانع ہے۔

تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ وَ تَنۡزِعُ الۡمُلۡکَ مِمَّنۡ تَشَآءُ

آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں۔

تو ملک میں جس کو چاہے اور جو چاہے عطا کرتا ہے یا لوٹا لیتا ہے۔ 'ملک' کا لفظ تین بار استعمال ہوا۔ پہلی جگہ عام ہے اور دوسرے دو مقامات میں اُس کا حصر ہے کہ ملک کا کچھ حصہ۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ ملک سے 'نبوت' مراد ہے اور اس کا چھیننا یہ ہے کہ ایک قوم سے دوسری میں منتقل کر دی جائے

وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ اور جس کو آپ چاہیں

غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں۔
دنیا میں یا آخرت میں یا ہر دو میں نصرت و توفیق کے ذریعہ عزت دیتا ہے اور اِدبار و خِذلان سے ذلیل و رُسوا کرتا ہے۔
بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔
یہاں صرف خیر کا ذکر کیا ہے کیونکہ خیر ہی مقصود بالذات ہے اور شر مقصود بالعرض، کیونکہ شر محض کا وجود نہیں جس میں کچھ خیر نہ ہو۔ یا خدا سے بزرگ ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف خیر کا ذکر کیا۔ یا اس لیے کہ کلام کا سیاق و سباق اور آیۃ کا شانِ نزول صرف خیر کو چاہتا ہے کیونکہ یہ آیۃ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خندق کا اندازہ لگایا اور ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ خندق کھودنا ذمہ لگایا۔ سب کھودنے لگے تو اچانک ایک بڑی چٹان ظاہر ہوئی جس پر کدال اثر نہ کرتے تھے صحابہ کرام نے حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضور علیہ السلام کی طرف بھیجا کہ آپ کو اس بات کی اطلاع کریں، چنانچہ آپ تشریف لائے اور اسے توڑنے لگے آپ نے ایک ہی ضرب لگائی تھی کہ چٹان پھٹ گئی اور اس میں سے بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی جس نے تمام ماحول کو روشن کر دیا جیسے اندھیرے گھر کے درمیان چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ تو آپ نے تکبیر کہی اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی نعرۂ تکبیر لگایا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس روشنی میں مجھے حیرہ کے محلات چمکتے ہوئے نظر آئے گویا وہ کلاب کے دانت چمک رہے ہوں۔ آپ نے دوسری مرتبہ ضرب لگائی اور پھر فرمایا کہ مجھے سلطنت روم کے سرخ محل چمکتے دکھائی دیے۔ پھر تیسری ضرب لگائی اور فرمایا کہ مجھے اس میں

صنعاء (یمن) کے محلات واضح نظر آئے ہیں اور مجھے جبریل علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ میری اُمت ان سب پر غالب آجائے گی۔ یہ سُن کر تمام مسلمان خوش ہو گئے مگر منافقین کہنے لگے: "کتنے تعجب کی بات ہے۔ تمہیں جھوٹ آرزوئیں دلاتا ہے اور باطل وعدے کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ حیرہ کے محلات اور کسریٰ کے شہر یثرب سے دیکھ رہا ہے اور یہ کہتا ہے کہ وہ سب تمہارے ہاتھ فتح ہوں گے اور حال یہ ہے کہ تم کافروں سے ڈر کے مارے خندق کھود رہے ہو۔" اس پر یہ آیۃ نازل ہوئی اور متنبہ کر دیا کہ شر بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور فرمایا انك علی کل شيءٍ قدیرٌ۔

تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ آپ رات (کے اجزا) کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور (بعض فصلوں میں) دن (کے اجزا) کو رات میں داخل کر دیتے ہیں اور آپ جاندار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے بیضہ سے بچہ) اور بے جان چیز کو جاندار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرندے سے بیضہ) اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔

اپنی قدرت کے بیان کے بعد یہ فرمایا کہ وہ رات اور دن کو لاتا لے جاتا ہے، موت اور حیات پر قادر ہے اور اُس کا فضل بڑی وسعت والا ہے۔ یہ چیزیں، دلیل کے طور پر لائی گئیں کہ جو ذات ان پر قدرت رکھتی ہے وہ ذلیل و رسوا کرنے، عزت دینے، ملک عطا کرنے اور اُس کے چھین لینے پر بھی قادر ہے ——— اور "ولوج" تنگ مقام میں داخل ہونے کو کہتے ہیں اور ایلاج لیل و نہار کا یہ مطلب ہے کہ انہیں ایک دوسرے میں داخل کرتا ہے یکے بعد دیگرے لانے سے یا

اُن کے اوقات میں کمی بیشی کر دینے سے ـــــ اخراج الحی من المیت و بالعکس سے مُراد مادّہ سے حیوان (جاندار) کی پیدائش اور بالعکس اس کو موت دینا ہے۔ یا[۲] حیوان (تمام جاندار) کا نطفہ سے پیدا کرنا اور پھر اُس سے نطفہ پیدا کرنا مراد ہے۔ اور[۳] یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب مومن سے کافر کا پیدا کرنا اور کافر سے مومن بنانا ہے۔

ابنِ کثیر، ابو عمرو، ابن عامر اور ابوبکر نے مَیِّت کو مَیْت (بسکون الیاء) پڑھا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مسلمانوں کو چاہیے کہ کفار کو (ظاہراً یا باطناً) دوست نہ بنائیں۔

اُن کی دوستی سے روکا ہے کہ اُن سے ایسی دوستی نہ لگائیں جیسے زمانہ جاہلیت میں تعلقات اور رشتہ داریاں وغیرہما تھیں تاکہ ان کی محبت اور بغض صرف اللہ کے لیے ہوں۔ یا[۲] مومنوں کو کافروں سے غزوات اور دینی امور میں مدد لینے سے روکا ہے۔

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کر کے۔

اس میں اشارہ ہے کہ مومنین ہی دوستی کے مستحق ہیں۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا۔

یعنی کفار کو دوست بنائے گا۔

فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ سو وہ شخص اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں۔

یعنی خدا کی دوستی میں اُس کا کوئی حق نہیں جسے دوستی کا نام دیا جا سکتا ہو۔ کیونکہ دو حقیقی دشمنوں کی دوستی ایک جگہ (ایک دل میں) جمع نہیں ہو

سکتی۔ جیساکہ ایک شاعر کا قول ہے: ؎

تَوَدُّ عَدُوِّیْ ثُمَّ تَزْعَمُ اَنَّنِیْ صَدِیْقُکَ لَیْسَ النُّوْکُ عَنْکَ بِعَازِبٖ

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً مگر ایسی صورت میں کہ تم اُن سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو۔

البتہ اُن امور میں ان سے بچو (اور احتیاط کا پہلو اختیار کرو) جن میں احتیاط لازمی ہے۔ یا تقوی کو مدنظر رکھ کر (مفعول مطلق ہے) اور فعل کو 'مِنْ' سے متعدی کیا گیا (حالانکہ یہ بغیر صلہ آتا ہے) کیونکہ یہ تحذّروا اور تخافوا کے معنیٰ میں آیا ہے۔ یعقوب نے "تُقَاةً" کی بجائے "تَقِیَّةً" پڑھا ہے۔ گویا کفّار سے ظاہری معاملات ہوں یا باطنی تمام اوقات میں دوستی سے منع کیا گیا۔ سوائے اوقات مخصوصہ (خطرناک حالات) کے کیونکہ ایسے حالات میں دوستی کا اظہار جائز ہے۔ جیساکہ سیدنا ابن مریم علیہ السلام نے فرمایا: کُنْ وَسَطًا وَامْشِ جَانِبًا۔ کہ اُن کے ساتھ ظاہری معاشرت کرو مگر اُن کی موافقت قلبی سے کنارہ کش رہو۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور خُدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو خدا تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرکے اور اُس کے دشمنوں سے دوستی کرکے اُس کی ناراضی کا نشانہ نہ بنو۔ یہ وعید نہایت سخت ہے اور اس بات کو واضح کرتی ہے کہ جس بات سے منع کیا گیا ہے وہ بُرائی میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور 'نَفْسَہٗ' فرمایا کہ جان لیا جائے کہ جس چیز سے ڈرنا چاہیے وہ عذاب اور قہر الٰہی ہے جو اللہ جل جلالہٗ کی ذات سے صادر ہوگا اور کافروں سے ڈرنا قابلِ التفات نہیں۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ

اللّٰہُ آپ فرما دیجیے کہ اگر تم پوشیدہ رکھو گے اپنا ما فی الضمیر یا اُسے ظاہر کرو گے اللہ تعالیٰ اُسے (ہر حال میں) جانتے ہیں۔

یعنی کفار سے دوستی وغیرہ کے بارے میں وہ تمہارے ضمائر کو جانتا ہے خواہ تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو۔

وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ اور وہ تو سب کچھ جانتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

پس وہ تمہاری پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہر کو بھی۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں۔

اگر تم ان منع کردہ امور سے باز نہ آؤ گے تو وہ تمہیں سزا دینے پر قادر ہے اور یہ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ "کا بیان ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے تمام معلومات پر محیط ذاتی علم سے متّصف ہے ـــ اور ذاتی قدرت سے بھی متّصف ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی مقدورات اُس کے لیے ممکن ہیں اس لیے اُس کی نافرمانی پر جسارت نہ کرو کیونکہ اُسے ہر نافرمانی کا علم بھی ہے اور وہ اُس پر سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗ اَمَدًا بَعِيْدًا جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کیے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا اور اپنے بُرے کیے ہوئے کاموں کو بھی (اور) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا کہ اُس شخص کے اور اُس روز کے درمیان دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی۔

یومَ 'تودُّ' کا مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی جس دن ہر نفس اپنے اعمال کا ریکارڈ یا اپنے خیر و شر کا اجر حاضر پائے گا تو ہر نفس چاہے گا کہ کاش اُس کے اور اُس خوفناک دن کے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا۔ یا اُذْکُر جیسے کسی فعل کا مفعول بہ ہے۔ اور "تودُّ" "عمِلت" کی ضمیر غائب کا حال ہے یا "ما عملت من سوء" کی خبر ہے اور تَجِدُ "ما عملت من خیر" تک محدود ہے۔ اور مَا شرطیہ نہیں ہو سکتا کیونکہ "تودُّ" مرفوع ہے —— اور ایک روایت میں تودُّ کی بجائے وَدَّتْ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں "مَا" شرطیہ ہو سکتا ہے لیکن اُسے خبریہ (یعنی مَا موصولہ اور عملت صلہ تودُّ خبر) قرار دینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ ایک آنے والے واقعے کا بیان ہے اور قرأۃ مشہور کے بھی موافق ہے۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَاد اور خدا تعالیٰ تمہیں اپنی ذاتِ (عظیم الشان) سے ڈراتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں بندوں پر۔

تذکیر اور تاکید کے لیے دوبارہ لایا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بعض باتوں سے روکنا اور ڈرانا اُن کے حال پر مہربانی اور اُن کی خاطر بھلائی کی وجہ سے ہے یا یہ کہ وہ گناہ معاف بھی کرتا ہے اور سزا بھی سخت دیتا ہے اس لیے اُس کی رحمت کی امید رکھی جائے اور اس کے عتاب سے ڈرا جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ آپ فرما دیجیے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو۔

محبت اُس میلانِ نفس کا نام ہے جو کسی میں کمال دیکھ کر اُس کی طرف قرب حاصل کرنے کو پیدا ہوتا ہے۔ اور بندہ جب جان لیتا ہے کہ کمالِ حقیقی صرف اللہ ہی کے

لیے ہے اور یہ کہ جو کچھ بھی کمال وہ اپنے اندر پاتا ہے یا دوسروں میں دیکھتا ہے وہ سارا اللہ کی جانب سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم ہے اور اسی کی جانب اس کی انتہا ہے۔ تو پھر اُس (انسان) کی محبت صرف اللہ ہی کے لیے ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر اللہ تعالیٰ کے بندوں سے ہوتی ہے۔ اور یہ امر اُس میں اطاعت و رغبت پیدا کر دے گا جو قرب الی اللہ پر منتج ہوگی۔ اسی لیے محبت کی تفسیر ارادۂ اطاعت محبوب سے کی گئی اور عبادات میں اتباع و فرمانبرداری رسول کو بھی یہی مستلزم ہے (یعنی محبت کے ساتھ اتباع رسول اور آپ کی فرمانبرداری ضرور ہوتی ہے، وہ بیج ہے اور یہ پھل)۔ محبت لازمہ ہے اتباع رسول کا اور حرص علی المطاوعۃ کا۔

یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے۔

امر (فاتبعونی) کا جواب ہے۔ "یُحْبِبْکُمْ" کا معنیٰ ہے کہ وہ تم سے راضی ہوگا اور تمہاری زیادتیوں سے چشم پوشی فرما کر تمہارے قلوب سے پردے ہٹا دے گا پھر تمہیں اپنی جناب میں تقرب عطا کرے گا اور تمہیں اپنے "جوارِ قدس" میں جگہ دے گا۔ اس مفہوم کو استعارہ یا مقابلہ کے رنگ میں محبت سے تعبیر کیا۔

وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے عنایت فرمانے والے ہیں۔

اُس کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کو اپنا تا ہے۔ روایت ہے کہ جب یہود نے "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ" کہا تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب وفدِ نجران نے کہا کہ ہم مسیح کی عبادت خدا کی محبت کے لیے کرتے ہیں "اِنّما نعبد المسیح حبًا للہ" اُن

کے متعلق نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُن لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں خدا تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتے تھے اُن کو خطاب کیا گیا کہ اگر تم اپنے دعویٔ محبت میں سچے ہو تو (اتّباعِ رسول کرکے) اپنے عمل سے اُس کی تصدیق بھی کرو۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا (اور) آپ (یہ بھی) فرما دیجیے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ کی اور اُس کے رسول کی۔ پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ اعراض کریں۔

تَوَلَّوْا فعل ماضی بھی ہو سکتا ہے اور تائے تفعل کے حذف سے مضارع بھی ہو سکتا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ تو (سُن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے۔

یعنی اُن سے راضی نہیں اور نہ اُن کے اعمال کو (درجہ قبولیت دے کر) سراہتے ہیں اور لَا يُحِبُّهُم نہیں فرمایا تاکہ اس کا مفہوم تمام کافروں کے لیے عام ہو جائے اور یہ دلالت ہو کہ 'تولّی' کفر ہے۔ اس لیے اس حیثیت سے یہ خدا کی محبت کی نفی کرتی ہے اور یہ بھی دلالت ہوتی ہے کہ اللہ کی محبت مومنین کے لیے مخصوص ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ نے (نبوت کے لیے) منتخب فرمایا ہے (حضرت) آدم کو اور (حضرت) نوح کو اور (حضرت) ابراہیم کی اولاد (میں سے بعض) کو اور عمران کی اولاد (میں سے بعض) کو تمام جہان پر۔

یعنی رسالت اور خصائصِ روحانیہ و جسمانیہ میں منتخب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُن کاموں پر بھی قادر ہوئے جن پر اُن کے علاوہ اور لوگ قادر نہ ہو سکے۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول واجب قرار دی اور واضح فرمایا کہ یہی ایک ذریعہ ہے جو حبِّ الٰہی اور قربِ الٰہی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کے بعد اس آیۃ میں انبیاء علیہم السلام کے مناقب بیان فرمائے اُن کی طرف رغبت دلاتے ہوئے۔ اور اس سے ملائکہ پر اُن کی فضیلت ثابت کی۔ اور آلِ ابراہیم، سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اور سیدنا اسحٰق علیہ السلام ہیں اور رسول اکرم علیہ الصلوۃ والتسلیم بھی اُن میں داخل ہیں۔ اور آلِ عمران موسیٰ وہارون ہیں جو عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں عیسیٰ اور اُن کی والدہ جو عمران بن ماثان بن العاذار بن ابی یوز بن یوزن بن زربابل بن سالیان بن یوحنا بن اوشیا بن امون بن مشکن بن حازقا بن اخاز ابن یوثام بن عوزیا بن یورام بن سافط بن الیشا بن راجیم بن سلیمان بن داؤد بن الیشی بن عوبدا بن سلمون بن باعز بن بخشون بن عمیاد بن رام بن حصروم بن فارص بن یہودا بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں اور دونوں عمرانوں میں اٹھارہ سو سال کا فرق ہے۔

ذُرِّيَّةً بَعۡضُهَا مِنۢ بَعۡضٍ بعض ان میں بعض کی اولاد ہیں۔

یہ آلِ ابراہیم اور آلِ عمران سے حال یا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا آلِ ابراہیم و آلِ عمران اور نوح سے بدل یا حال ہے۔ یعنی یہ ایک ہی ذُرِّیَّۃ ہیں اور بعض بعض سے نکلے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ بعض، بعض سے دین میں مختلف ہوئے ہیں — اور ذُرِّیَّۃ — اولاد کو کہتے ہیں جس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی — الذَّرُّ سے فُعۡلِیَّہ کے وزن پر یا الذَّرۡءُ سے فُعۡولَۃ کے وزن پر آیا ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں ہمزہ کو 'یاء' سے بدل دیا گیا پھر 'واؤ' کو 'یاء' میں بدل دیا اور ادغام کر دیا۔

وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں۔

لوگوں[1] کے اقوال و اعمال کو سنتا جانتا ہے اور جو قول و عمل سے صراطِ مستقیم اختیار کرے اُسے چُن لیتا ہے۔ یا[2] یہ کہ عمران کی بیوی کی بات کو خوب سُن رہا تھا اور اس کی نیت کو خوب جانتا تھا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ

جبکہ عمران (پدرِ مریم) کی بی بی نے (حالتِ حمل میں) عرض کیا کہ اے پروردگار میں نے نذر مانی ہے آپ کے لیے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے۔ بعض[1] نے "اِذْ" کو "نَذَرْتُ" کا ظرف قرار دے کر منصوب بتایا ہے لیکن یہ امر متنازع فیہ ہے — بعض[2] نے اس کی ظرفیت فعل محذوف "اُذْکُرْ" کی بناء پر مانی ہے۔ اور یہ عورت "امرءۃ عمران" حنّہ بنت فاقوذ تھیں جو سیّدنا عیسٰی علیہ السلام کی نانی تھیں اور عمران بن یصہر کی بھی ایک بیٹی مریم نامی تھی جو حضرات موسٰی و ہارون علیہما السلام سے سن میں بڑی تھیں تو بعض لوگوں نے زوجہ عمران سے عمران بن یصہر کی بیوی مراد لی ہے حالانکہ اس کی تردید کھلّلہا ذکریّا کرتا ہے کیونکہ زکریّا علیہ السلام عمران بن ماثان کے ہمعصر تھے اور اس کی بیٹی "الیشاع" نامی سے شادی کی تھی۔ گویا عیسٰی علیہ السلام اور یحیٰی علیہ السلام خالہ زاد تھے — روایت ہے کہ (زوجہ عمران) بانجھ اور بوڑھی تھیں، ایک دن درخت کے سایہ میں بیٹھی تھیں کہ ایک پرندے کو دیکھا جو اپنے بچّوں کو دانہ کھلا رہا تھا۔ اُن کے دل میں اولاد کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ تمنّا کرنے لگیں پھر کہا "اے اللہ! بلے شک میں تیرے لیے نذر مانتی ہوں، اگر تو مجھے اولاد عطا کرے تو میں اُسے بیت المقدس پر وقف کردوں گی اور اُسے خدّام میں داخل کردوں گی"۔ چنانچہ "مریم" کا حمل ہوا اور عمران فوت ہوگئے۔ اور ایسی نذر اُن کے عہد میں لڑکوں کے لیے مشروع تھی تو اُس نے یا تو معاملہ تقدیر پر

چھوڑا یا یہ خیال کیا کہ لڑکا ہی پیدا ہوگا۔

مُحَرَّرًا کہ وہ آزاد رکھا جاوے گا۔

بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف ہوگا اور میں اُس سے کوئی کام نہ لوں گی یا عبادت کے لیے آزاد کر دوں گی۔ اور یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ سو آپ مجھ سے (بعد ولادت) قبول کر لیجیے۔

مجھ سے وہ چیز قبول فرمائیے جس کی میں نے نذر مانی ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے مِنِّیَ بفتح یاء پڑھا ہے اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ بے شک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں۔

آپ میرے قول کو سنتے ہیں اور نیّت کو جانتے ہیں۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰى پھر جب لڑکی جنی (حسرت سے) کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار میں نے تو وہ حمل لڑکی جنی۔

ضمیر مؤنث (ھا) ما فی بطنھا کی طرف راجع ہے اور مؤنث اس لیے لائے کہ واقعۃً مؤنث تھیں ــــ اور اُنثیٰ اُس سے حال ہے اور اس (حال) کا تانیث لانا یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مؤنث لائے یہ بھی مؤنث ہوگا کیونکہ حال اور ذو الحال ذات میں ایک ہی ہوتے ہیں ــــ یا اُس کی تانیث بتاویل مؤنث لائے جیسے نفس اور حبلہ کو مؤنث گردانا جاتا ہے لہذا اُس سے حال بھی مؤنث لائے ــــ حضرت حنہ اُمّ مریم نے یہ الفاظ اپنے رب کی طرف اظہارِ حسرت و غم کے لیے کہے تھے کیونکہ وہ تو لڑکے کی آرزو رکھتی تھی اور اسی لیے اُسے آزاد کرنے کی نذر مانی تھی۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اُس کو جو اُنہوں نے جنی۔

یہ جملہ مستأنفہ ہے ــــ یہ اللہ سبحانہ نے فرمایا تاکہ پیدا ہونے والے بچے (سیدہ مریم) کی عظمتِ شان اور اس کی عظمت سے اُس کی والدہ کی لاعلمی کا بیان کیا جائے۔ اور ابن عامر اور ابوبکر نے بروایتِ عاصم و یعقوب وَضَعْتُ پڑھا ہے۔ گویا یہ بھی زوجۂ عمران کا قول ہے اور اُس نے اپنے آپ تسلّی دینے کے لیے کہا ہے یعنی یہ کہ "اس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی کوئی خفیہ مصلحت ہوگی اور شاید (میرے حق میں لڑکے سے) لڑکی ہی بہتر ہو" اور وَضَعْتِ بھی پڑھا گیا ہے اس بناء پر کہ یہ اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہے۔

وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى اور (وہ) لڑکا (جو انہوں نے چاہا تھا) اُس لڑکی کے برابر نہیں۔

واللہ اعلم بما وَضَعَتْ کا بیان ہے اور اس میں دو احتمال ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہو کہ "جیسی نرینہ اولاد کے لیے تو نے دعا کی تھی وہ اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتی تھی جو میں نے عطا کی ہے، یہ لڑکی لڑکے سے اعلیٰ و افضل ہے" اس صورت میں دونوں جگہ (الذکر اور الأنثیٰ میں) لام عہد کا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حضرت حنہؓ کا قول ہے کہ جس مقصد سے میں نے نذر مانی ہے کہ مرد قوت و صلاحیت کی وجہ سے زیادہ خدمت بجا لا سکتا ہے اور عورت بوجہ شرم و حیا اور عارضہ حیض و نفاس کے نہیں بجا لا سکتی" اس تقدیر پر دونوں جگہ الف لام جنس کا ہوگا۔ پہلی تأویل اچھی ہے۔

وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا۔

امرءۃ عمران کے پہلے قول پر عطف ہے اور درمیانی حصہ جملاتِ معترضہ

ہیں ــــ اور اس امر کا ذکر خدا تعالیٰ کے حصولِ تقرب اور بچی کے لیے دعا کی خاطر ہے کہ "خدا اُسے محفوظ رکھے اور اُس کی اصلاح فرمائے تاکہ اُس کی زندگی اس کے نام کے مطابق ہو" کیونکہ اُن کی زبان میں مریم کے معنیٰ عابدہ کے ہوتے ہیں۔ اس میں دلیل ہے کہ اسم، مسمّٰی اور تسمیہ متغایر امور ہیں۔

وَ اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ اور میں اس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تیری حفاظت میں دیتی ہوں۔

وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور اُس کی اولاد کو بھی (اگر کبھی اولاد ہو) شیطان مردود سے۔

الرجیم کا معنیٰ المطرود (دھتکارا ہوا) اور رَجم کا اصل معنیٰ ہے پتھر پھینکنا ــــ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلَّا وَالشَّیْطَانُ یَمَسُّهٗ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَهِلُّ مِنْ مَسِّهٖ اِلَّا مَرْیَمَ وَابْنَهَا" یعنی شیطان ہر نومولود کو چھوتا ہے جس سے وہ روتا ہے۔ مگر مریم اور عیسٰی علیہما السلام کو اللہ کریم نے حضرت حنّہ کی دعا "اِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ" الخ کی برکت سے محفوظ رکھا۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ پس اُن (مریم علیہا السلام) کو اُن کے رب نے بوجہِ احسن قبول فرمالیا۔

یعنی خدا تعالیٰ نے مریم (علیہا السلام) کو نرینہ اولاد کی بجائے قبول فرمایا۔ بقبولٍ حَسَنٍ یعنی جس طور سے نذر قبول ہوتی ہے اُس میں بہتر طور سے قبول فرمایا یعنی اُسے نرینہ وقف کا درجہ دیا ــــ یا اُس کی ولادت کے معاً بعد ہی ــــ قبل اس کے کہ وہ بڑی ہو اور سدانت کا عہدہ سنبھالے خدا تعالیٰ نے اسے قبول فرمالیا ــــ روایت ہے کہ جب حنّہ کے ہاں مریم پیدا ہوئی تو وہ اُسے

ایک کپڑے میں لپیٹ کر مسجد میں لے گئیں اور احبار کے سامنے رکھ کر کہنے لگیں کہ "لو، یہ نذرانہ ہے" اس پر احبار میں سے ہر ایک نے اُسے لینا چاہا کیونکہ وہ اُن کے امام اور بنی ماثان کی بیٹی تھیں اور بنی ماثان بنی اسرائیل کے سرداروں اور شاہی خاندان میں شمار تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا کہ "میں اس کا زیادہ حقدار ہوں کیونکہ میرے گھر میں اس کی خالہ "ایشاع" ہیں" مگر دوسرے قرعہ اندازی کے بغیر نہ مانے اور وہ ستائیس آدمی تھے۔ چنانچہ وہ ایک دریا پر گئے اور اس میں اپنے قلم پھینک دیئے تو حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم تیرتا رہا جبکہ باقیوں کے قلم بیٹھ گئے اور شرط تیرنا تھی چنانچہ زکریا علیہ السلام نے ہی مریم کی کفالت سنبھالی۔

—— اور مضاف کے مقدر ہونے کی صورت میں بقبولٍ حسنٍ مصدر بھی ہو سکتا ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی بِذِی قَبُوْلٍ حَسَنٍ اور تَقَبَّلَ بمعنی اِسْتَقْبَلَ بھی ہو سکتا ہے جیسے تقضّی اور تعجّل بمعنی استعجل (عجلت چاہی) یعنی خدا تعالیٰ نے اُسے پیدائش سے ہی قبولیت حسنہ دے دی۔

وَّ أَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا اور عمدہ طور پر اُن کو نشو و نما دیا۔

یعنی اُس کی خوب تربیت فرمائی اور نَبَاتًا غیر باب سے (أَنْبَتَ کا) مفعول مطلق ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی انبتها فَنَبَتَتْ نَبَاتًا حَسَنًا۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا اور (حضرت) زکریا کو اُن کا سرپرست بنایا۔

حمزہ، کسائی اور عاصم نے کَفَّلَ کی فاء کو مشدد پڑھا ہے اور زکریّا کو مقصور، مگر عاصم نے مقصور نہیں کیا جو انہوں نے ابن عیاش سے روایت کیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کو فاعل اور زکریا کو ثانی مفعول کہا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کو حضرت مریم کا کفیل بنایا اور اس کے مصالح کا ضامن کیا۔ باقی قرّاء نے کفل کی فاء کو غیر مشدد (کَفَلَ) پڑھا ہے اور زکریّاءُ کو فاعل قرار دے کر

بألف ممدودہ (زکریّاءُ) پڑھا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ (۳۷) جب کبھی زکریا (علیہ السلام) اُن کے پاس عبادت خانہ میں تشریف لاتے۔

محراب سے مراد غرفہ (کمرہ) ہے جو خاص طور پر حضرت مریم علیہا السلام کے لیے بنایا گیا تھا۔ یا مسجد یا مسجد کا افضل اور آگے کا حصّہ اور وہ محراب اس لیے کہلاتا ہے کہ شیطان سے جنگ کرنے کا مقام ہے۔ گویا مریم علیہا السلام کو بیت المقدس کے نمایاں اور اشرف حصّے میں جگہ دی گئی تھی۔

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا تو اُن کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے۔

یہ کُلَّمَا کا جواب ہے لہٰذا منصوب ہے۔ روایت ہے کہ مریم علیہا السلام کے کمرہ میں زکریا علیہ السلام کے سوا کوئی نہ جاتا تھا اور جب وہ نکلتے تو ساتوں دروازے بند کر دیتے، پھر بھی وہ حضرت مریم کے پاس گرمی کے موسم میں سرما کے میوے اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل موجود پاتے۔

قَالَ يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں؟

یعنی یہ بے موسم پھل تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں جبکہ دروازے بھی بند ہوتے ہیں اور یہ آیۃ کراماتِ اولیاء کے جواز کی دلیل ہے ——— اور اس معاملے میں حضرت زکریّا علیہ السلام کا استبعاد اس بات کو رد کرتا ہے کہ یہ اُن کا معجزہ ہو۔

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔

یعنی آپ اسے بعید نہ سمجھیں ——— کہتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بچپن میں کلام کیا اور اُس نے کسی عورت کے پستان کا دودھ

نہیں بیا اور آپ کی خوراک جنت سے آپ کے پاس آتی تھی۔

اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاۗءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں۔

یعنی اتنی کثرت سے کہ اُس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ یا بغیر استحقاق کے محض اپنے فضل و مہربانی سے ــــ یہ حضرت مریم علیہا السلام کا کلام بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو ــــ روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور دو روٹیاں اور گوشت کا ایک ٹکڑا پیش کیا۔ آپ وہ طشتری واپس فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس لائے اور فرمایا "اے بیٹی! یہ لو (اپنے برتن)" انہوں نے طشتری کو کھول کر دیکھا تو وہ روٹیوں اور گوشت سے پُر تھی۔ آپ نے پوچھا: اَنّٰی لَکِ ھٰذَا؟ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا "ھو من عند اللہ ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب"۔ آپ نے فرمایا: "خدا کا شکر ہے کہ اُس نے تجھے سیدہ بنی اسرائیل (مریم علیہا السلام) جیسا بنایا۔ پھر آپ نے حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین اور اپنے اہل بیت کو بلایا۔ اُن سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور کھانا ویسے کا ویسا بچ گیا۔ پھر وہ کھانا حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہمسایوں کو تقسیم کر دیا۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ اِس موقع پر دُعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے۔

ھُنَالِکَ سے مُراد اُسی جگہ یا اُسی وقت کیونکہ ھنا، ثَمَّ اور حیثُ استعارۃً وقت کے لیے بھی آتے ہیں ــــ جب زکریا علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کی کرامت اور مرتبہ دیکھا تو دُعا کی۔

قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً عرض کیا کہ اے میرے رب عنایت کیجیے مجھے خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد۔

جس طرح تو نے عمر رسیدہ بانجھ حنہؓ کو اولادِ صالحہ دی ــــ کہتے ہیں کہ جب اُنہوں نے بے موسم کے پھل دیکھے تو آپ کو خیال ہوا کہ ایک عاقرہ کے ہاں بوڑھے مرد سے اولاد کا ہونا ممکن ہے تو آپ نے بھی اللہ تعالیٰ سے اولادِ صالح کی دعا مانگی۔ عرض کیا هب لی من لدنك ذريةً طيبةً کیونکہ یہ چیز عمومی وجوہ اور اسباب ظاہری کے مطابق نہ تھی۔

اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ بے شک آپ بہت سننے والے ہیں دُعا کے۔ پس پکار کر کہا اُن سے فرشتوں نے۔

یعنی دعا قبول کرنے والے یا جواب دینے والے۔ یعنی ملائکہ کی جنس میں سے کسی فرد نے پکارا۔ جیسے کہتے ہیں زیدٌ یرکب الخیل (زید گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) بولا جاتا ہے حالانکہ وہ ایک ہی پر سوار ہوتا ہے ــــ کیونکہ ندا دینے والے صرف جبریل علیہ السلام تھے۔ حمزہ اور کسائی نے (نَادٰىهُ) بصیغہ مذکر اور بالامالہ پڑھا ہے۔

وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اور وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں۔

یعنی قائم فی الصلوٰة ــــ یُصَلِّی قائم کی صفت[1] ہے یا خبر[2] ہے یا دوسرا[3] حال ہے یا قائم کی ضمیر سے حال[4] ہے۔

أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحیٰی کی (جن کے احوال یہ ہونگے کہ)

أَنَّ[1] سے پہلے ب، مقدر ہے اَی بِاَنَّ اللہ ــــ نافع[2] اور ابن عامر نے إِنَّ

میں ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اور اس سے پہلے قَالَت مقدّر مانا ہے یعنی ارادہ قول۔ یا[1] اس لیے کہ ندا، بھی قول کی قسم ہے —— حمزہ اور کسائی نے اسے یَبْشُرُكَ پڑھا ہے۔ یحییٰ عجمی نام ہے اور اگر عربی ہی مان لیں تو معرفہ اور وزن فعل کی وجوہات کی بناء پر غیر منصرف ہوگا۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔

کلمۃ من اللہ سے عیسٰی علیہ السلام مُراد ہیں۔ آپ اس لیے کلمۃ اللہ قرار دیئے گئے کہ آپ بغیر باپ کے خاص اَمرِ الٰہی سے پیدا ہوئے اور اس طرح خوارق میں شمار ہوئے جو عالمِ امر سے ظہور میں آتے ہیں۔ یا اس سے مراد کتاب[2] اللہ ہے اور کتاب اللہ کو کلمۃ کہنا اسی طرح ہے جیسے حویدرہ شاعر کے قصیدے کو کلمۃ حویدرۃ کہتے ہیں۔ (مجاز مرسل یعنی جزء کا کل پر اطلاق)

وَسَيِّدًا اور مقتدا ہوں گے۔

وہ قوم کی سرداری کریں گے۔ اور اُن سے ممتاز اور فائق ہوں گے۔ اور واقعۃً اپنی قوم میں فائق تھے کیونکہ آپ نے کبھی کسی معصیت کا ارادہ نہیں کیا۔

وَحَصُوْرًا اور اپنے نفس کو (لذّات سے) بہت روکنے والے ہونگے۔

یعنی نفس کو شہوات اور ملاہی سے روکنے میں انتہا پر ہوں گے۔ روایت ہے کہ بچپن میں ایک مرتبہ آپ بچوں کے پاس سے گزرے اور اُنھوں نے آپ کو کھیلنے کے لیے بُلایا تو آپ نے فرمایا: مَا لِلَّعِبِ خُلِقْتُ (میں کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا گیا)۔

وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ اور نبی بھی ہوں گے اور اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہونگے۔

یعنی صالحین میں پرورش پائیں گے یا ایسے صالحین میں سے نبوت کے مقام پر فائز ہونگے جو کبائر و صغائر کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

قَالَ رَبِّ أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ زکریا نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا۔

یہ کہا کیونکہ یہ امر خارق عادت بظاہر ناممکن تھا یا اُس کو عظیم سمجھتے ہوئے یا اظہار تعجب کی خاطر یا اُس کے ظاہر ہونے کی کیفیت (اور اُس کی تفصیلات) معلوم کرنے کے لیے استفہام کے طور پر عرض کیا

وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ حالانکہ مجھے بڑھاپا آپہنچا۔

میں بوڑھا ہوچکا ہوں اور بڑھاپے کے اثرات مجھ میں ظاہر ہیں ـــ اُس وقت اُن کی عمر ننانوے ۹۹ سال تھی اور آپ کی بیوی کی عمر اٹھانوے ۹۸ سال۔

وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ اور میری بی بی بچہ جننے کے قابل نہیں رہی۔

یعنی وہ بچہ نہیں جن سکتی۔ عاقر، عقر سے ہے جس کا معنیٰ ہے قطع یعنی جس کو اولاد ہونے کی امید نہ رہے۔

قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسی حالت میں لڑکا ہو جاوے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں۔

یعنی عجائب میں سے جو چاہتا ہے ظاہر کرتا ہے۔ جیسے یہ فعل کہ شیخ فانی اور بانجھ عورت سے اولاد پیدا کی یا یہ کہ جیسے تیرا معاملہ ہے اور تیری بیوی کا کہ تو معمر ہے اور تیری بیوی بانجھ ـــ اولاد کی پیدائش کے سلسلے میں جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یا كذالك الله مبتدا اور خبر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ایسی ہی صفات کا مالک ہے اور "يفعل ما يشاء" اُس کا بیان ہے۔ یا "كذالك" مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی یوں ہوگا کہ "الامر كذالك" اور "الله يفعل ما يشاء" اُس کا بیان ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّي آيَةً انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار میرے

واسطے کوئی نشانی مقرر کر دیجیے۔

ایسی نشانی جس سے میں اپنی بیوی کے حاملہ ہونے کا وقت معلوم کر سکوں اور کھلے چہرے سے بشاشت کے ساتھ اُس کا استقبال کروں اور شکر بجالاؤں اور انتظار کی تکلیف و مشقت مجھ سے زائل ہو۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے۔

اور فی الواقع یہی ہوا کہ آپ کی زبان مبارک خاص طور پر لوگوں کے ساتھ بات کرنے سے بند ہو گئی تاکہ آپ اس عرصے کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی نعمت کے شکریہ بجالانے میں صرف کر سکیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ تیری زبان سوائے میرے ذکر و شکر اور تسبیح کہنے کے بند ہو جائے گی۔ اور بہترین جواب وہی ہوتا ہے جو (سوال کرنے والے کے) سوال سے ہی اخذ کیا جائے۔

اِلَّا رَمْزًا بجز اشارہ کے۔

یعنی ہاتھ یا سر کے اشارے سے اور رمز کا اصل معنی (ہلانا اور) حرکت کرنا ہے اور اسی لیے "راموز" سمندر (یا دریا) کو کہتے ہیں اور یہ استثنائے منقطع ہے اور بعض نے کہا کہ استثنائے متصل ہے اور کلام سے مراد دل کی بات زبان سے ظاہر کرنا ہے اور "رَمْزًا" کو رَمَزًا بھی پڑھا گیا ہے جیسے خَدَمٌ اور اس صورت میں یہ رَامِزٌ کی جمع تصور ہوگی جیسے خَادِم سے خَدَم اور اسے رُمُزًا بھی پڑھا گیا جو رَمُوْزٌ کی جمع ہے جیسے رُسُل جمع رسول کی۔ اس بات پر کہ یہ حضرت زکریا علیہ السلام اور النَّاس (لوگوں) دونوں سے حال ہے لہٰذا اُس سے رُمُزًا حال لایا گیا۔ جیسا کہ ذیل کے شعر میں کلمہ "فَرْدَيْنِ" متکلم اور مخاطب دونوں سے حال واقع ہوا ہے:

ے مَتٰی مَا تَلْقَنِیْ فَرْدَیْنِ تَرْجُفُ   رَوَانِفُ اَلْیَتَیْکَ وَ تُسْتَطَارَا

(ترجمہ: جب تُو اور مَیں اکیلے ملیں گے تو تیرے اطرافِ سرین مضطرب اور متفرق ہونے لگیں گے یعنی تو حد درجہ بزدل ہے کہ تیرا یہ حال ہونے لگے گا)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا اور اپنے رب کو (دل سے) بکثرت یاد کیجیو۔

یعنی ان (تین) دنوں میں جب تیری زبان گفتگو سے بند رہے۔ اور یہ اپنے ما قبل کی تاکید میں آیا ہے جو زبان کو بند رکھنے کی غرض اور مقصود کو واضح کرتا ہے اور ساتھ "کثیرًا" کی قید اس پر دلالت کرتی ہے کہ امر میں تکرار نہیں ہے۔

وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ اور (زبان سے بھی) تسبیح (و تقدیس) کیجیو دن ڈھلے بھی۔

عَشِیّ کا معنی زوال سے غروب تک کا وقت یا عصر سے لے کر یا غروب سے لے کر رات کا پہلا حصہ گزرنے تک۔

وَالْاِبْكَارِ اور صبح کو بھی (کہ اس کی قدرت رہے گی)

طلوعِ فجر سے چاشت کے وقت تک اور اسے اَبْکَار بھی پڑھا گیا۔ اس صورت میں یہ بَکَر کی جمع ہوگی جیسی سَحَر کی جمع اَسْحَار آتی ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جبکہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بلاشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلے میں منتخب فرمایا ہے۔

اُن (فرشتوں) نے حضرت مریم سے بالمشافہ باتیں کیں اُن کی (بزرگی اور) کرامت کی خاطر۔ اور معتزلہ وغیرہ جنہوں نے سیدہ مریم علیہا السلام کی اس کرامت کا انکار کیا ہے، اُنہوں نے کہا کہ یہ حضرت زکریا علیہ السلام کا معجزہ تھا یا یہ کہ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ابتدائی نشانات تھے (یعنی اس لیے کہ آپ کی گود میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا رہے تھے ـــ) کیونکہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی نہیں بنایا (لہٰذا یہ حضرت مریم کا معجزہ نہیں ہو سکتا) اور اس اجماع کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وما ارسلنا قبلك الا رجالاً (یعنی ہم نے آپؐ سے پہلے جو رسول بھیجے وہ مرد ہی تھے)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرشتوں نے (آمنے سامنے باتیں نہیں کی تھیں بلکہ) اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اور پہلے جو اصطفٰك میں اصطفاء فرمایا اس کا معنی ہے کہ حضرت مریم کو اُن کی ماں سے قبول فرمایا حالانکہ اس سے پہلے کسی لڑکی کو (عبادت وخدمتِ مسجد وغیرہ کے لیے خادمہ کے طور پر) قبول نہیں کیا گیا تھا اور یہ کہ اُنہیں عبادت کے لیے فارغ کر دیا اور کمائی وغیرہ کی بجائے جنّت سے رزق پہنچا کر مستغنی و بے نیاز کر دیا اور یہ کہ اُنہیں اُن باتوں سے پاکیزہ بنایا جو عورتوں میں قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہیں۔ اور دوسری بار جو اِصطَفَاكِ فرمایا اس کا مطلب ہے اُنہیں ہدایت دی اور فرشتوں کو ان کی طرف بھیجا اور بلند و بالا واضح کرامات سے نوازا جیسے بغیر شادی کے بیٹا عطا فرمایا اور بچے کو گویائی دے کر اس بہتان سے آپ کو بری کر دیا جو یہود نے آپ پر لگایا تھا اور اُنہیں اور اُن کے بیٹے کو تمام جہان (والوں) کے لیے نشانی بنا دیا۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اے مریم اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو اُن لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

آپ کو نماز باجماعت کا حکم دیا گیا اور نماز کی محافظت و پابندی میں تاکید

کی خاطر اُس کے ارکان کا ذکر بھی کر دیا ـــــ اور سجدے کو رکوع سے پہلے ذکر کیا اس[1] لیے کہ ان کی شریعت میں ایسے ہی ہو یا[2] اس لیے کہ واؤ (حرفِ عطف) سے ترتیب لازم نہیں آتی یعنی ہو سکتا ہے سجدہ رکوع کے بعد ہی ہو مگر یہاں پہلے ذکر کر دیا۔ یا[3] اس لیے کہ اِرْكَعِي کو رَاكِعِين کے ساتھ ملا دینا مقصود تھا یہ بتانے کے لیے کہ جن کی نماز میں رکوع نہیں وہ نمازی ہی نہیں ہیں ـــــ اور کہا گیا ہے کہ قُنوت سے مراد طاعت پر دوام وہمیشگی ہے جیسے فرمایا آمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَائِمًا ـــــ {یعنی وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں (اللہ تعالیٰ کی) فرمانبرداری میں سجدے اور قیام میں رہتا ہے} ـــــ اور یہ کہ سُجود سے مراد نماز ہے جیسے فرمایا وَ اَدْبَارَ السُّجُود {اور سجدوں یعنی نماز کے بعد} ـــــ اور یہ کہ رکوع سے عاجزی و فروتنی اور تواضع و انکساری مُراد ہے۔

ذَالِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ یہ قصے منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں ہم اُن کو وحی بھیجتے ہیں آپ کے پاس

یعنی یہ واقعات اور باتیں جو ہم نے ذکر کی ہیں یہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں آپ وحی سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اور آپ اُن لوگوں کے پاس نہ تو اُس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے۔

(اقلام سے مراد) اُن کے تیر (ہیں) جو وہ قرعہ اندازی کے لیے ڈال رہے تھے اور یہ بھی کہا گیا کہ اُنھوں نے اپنے قلموں سے ہی قرعہ اندازی کی تھی جن سے وہ توراۃ لکھتے تھے اور برکت کی خاطر ایسا کیا تھا۔ اور اس سے مُراد یہ ثابت کرنا

ہے کہ یہ اللہ کی وحی ہی ہے اور یہ منکرینِ وحی کا مذاق اُڑانے کی خاطر بطورِ الزام کہا گیا ـــــ کیونکہ واقعات کا جاننا دو طریق سے ہوتا ہے : مشاہدہ سے یا سننے سے ۔ تو جہاں تک سننے کا تعلق ہے سب لوگ جانتے تھے اور اُنہیں کسی قسم کا شک نہ تھا (کیونکہ حضور علیہ السلام نے کتبِ سماویہ وغیرہا کا کوئی علم نہ سیکھا تھا بلکہ آپ اُمّی تھے اور اہلِ مکہ بھی کتبِ سماویہ کا علم نہ رکھتے تھے تو پھر آپ یہ واقعات کہاں سے سُنتے سوائے وحی کے)۔ رہی یہ بات کہ آپ پر یہ الزام لگایا جائے کہ آپ نے بچشمِ خود یہ واقعات دیکھے ـــــ تو کوئی عقلمند اس بات کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا (کیونکہ آپ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے صدیوں بعد تشریف لائے تھے دیکھنا کہاں ؟)

أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ کہ اُن سب میں کون شخص حضرت مریم (علیہا السلام) کی کفالت کرے۔

یہ اُس محذوف سے متعلق ہے جس پر یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ دلالت کرتا ہے (وہ محذوف یوں تھا لِيَعْلَمُوْا[1] یا[2] لِيَقُوْلُوْا ـــ أَيُّهُم) یعنی وہ قلمیں اس لیے ڈال رہے تھے تاکہ وہ جان لیں کون کفالت کرے گا یا تاکہ وہ کہیں فلاں کفالت کرے گا۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ اور نہ آپ اُس وقت موجود تھے جبکہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کو عمدہ اور نفیس جانتے ہوئے وہ جھگڑ رہے تھے (ہر ایک کہتا تھا کہ میں کفالت کروں گا)

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ (اُس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے (یہ بھی) کہا۔

یہ پہلے إِذْ قَالَتْ کا بدل ہے اور درمیان میں تمام جملہ ہائے معترضہ (ضمناً ذکر

کیا گیا) ہیں ـــــ یا یہ اِذْ یختصمون سے بدل واقع ہوا ہے اس بنا پر کہ جھگڑا اور یہ (اِذْ قَالَتْ والی) بشارت ایک طویل عرصے میں ہوئے، ایک ہی وقت میں نہیں۔ جیسے آپ کہتے ہیں میں اُسے فلاں سال ملا (تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ سارا سال آپ اُس کے پاس رہے جُدا نہ ہوئے۔ اسی طرح جھگڑا اور وقت میں ہوا اور بیٹے کی بشارت اور وقت میں ـــ)

يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ کہ اے مریم بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا اُس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا

مسیح آپ کا لقب ہے بزرگی کے القاب میں سے جیسے کہا جاتا ہے صِدّیق۔ اور اس کی اصل عبرانی زبان میں (لفظ) مشیح ہے اور اس کا معنی ہے برکتوں والا اور عیسیٰ، ایشوع (عبری) سے معرّب ہے ـــــ اور یہ کہنا کہ ان دونوں لفظوں مسیح اور عیسیٰ کو مَسح اور عیس سے بنایا گیا ہے اس بناء پر کہ آپ کو برکت سے چھُوا گیا تھا یا کہ آپ کو گناہوں سے پاک بنا دیا تھا یا یہ کہ آپ زمین میں چلتے پھرتے (سیاحت کرتے) رہے تھے اور کسی ایک جگہ نہ ٹھہرتے تھے یا یہ کہ آپ کو جبریل علیہ السلام نے چھُوا تھا اور عیس اُس سفیدی کو کہتے ہیں جس پر سُرخی غالب ہو یہ سراسر تکلف ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں۔ اور ابن مریم صفت ہے جس نے تمیز کر دی ہے جیسے اسماء تمیز و فرق یا وضاحت کے لیے آجاتے ہیں (اور اس صفت کو بھی ناموں کے ساتھ پرو دیا گیا) ـــ اور خبروں کا زیادہ ہونا مبتدا کے ایک ہونے کو مانع نہیں اسمہ مبتدا اور المسیح عیسیٰ ابن مریم تین خبریں۔ کیونکہ یہ (ابنُ مریم) اسم جنس مضاف ہے ـــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مُراد لیا جائے کہ وہ شخص جو

اس سے پہچانا جاتا ہے اور اپنے سوا دوسروں سے فرق کیا جاتا ہے وہ یہ تین ناموں والا ہے۔ کیونکہ اسم تو مسمیٰ کی علامت ہوتی ہی ہے اور جو کوئی امتیازی نام ہوگا تو وہ صرف اسی کا ہوگا ــــ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ مبتدا محذوف کی خبر ہو اور ابن مریم (خبر کی) صفت ہو۔ (یعنی اِسْمُہ المسیحُ پر جملہ ختم اور آگے نیا جملہ ھو عیسی ابن مریم) ــ اور خطاب حضرت مریم سے تھا تو پھر ابن مریم کیوں کہا۔ یُوں کیوں نہ کہا کہ تیرا بیٹا ہوگا اس لیے کہ یہ بتانا مقصود تھا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوگا کیونکہ اولاد تو باپ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور ماں کی طرف منسوب نہیں کی جاتی سوائے اس کے کہ باپ کا پتا نہ ہو۔

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ باآبرو ہونگے دنیا میں اور آخرت میں۔

یہ حال ہے "کَلِمَةٍ" سے اور (ذوالحال ہمیشہ معرفہ ہوتا ہے یہاں نکرہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ) یہ نکرہ موصوفہ ہے (جو معرفہ کے مُساوی ہوتا ہے یعنی بکلمةٍ منه اسمه المسیح ــــ اسمه المسیح اُس کی صفت ہے) اور (کلمةٍ مؤنث ہے تو اُس کا حال وجیھًا) مذکر اس لیے آیا کہ کلمة کا معنوی اعتبار کیا گیا (کہ اس سے مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہیں) اور دنیا میں وجیہہ ہونے کا مطلب ہے نبوت ملے گی اور آخرت کی وجاہت سے مراد ہے حقِ شفاعت۔

وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ اور منجملہ مقربین کے ہوں گے۔

یعنی اللہ کا قرب پائیں گے ــــ یہ بھی کہا گیا کہ یہ اُن کے جنت میں بلندیٔ مرتبت کی طرف اشارہ ہے ــــ یا یہ کہ اُن کے آسمان کی طرف اُٹھائے جانے اور صحبتِ ملائکہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا اور آدمیوں سے کلام

کریں گے گہوارہ میں (یعنی بالکل بچپن میں بھی) اور بڑی عمر میں بھی۔
پیغمبروں کی سی باتیں کرنا بغیر کسی فرق کے ــــ "مَهْد" مصدر ہے اور یہ اُس چیز کو نام دیا گیا جو بچے کے لیٹنے کی جگہ پر بچھائی جاتی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ آپ کو جوانی میں (آسمان پر) اُٹھا لیا گیا تھا اور اس طرح "وَكَهْلًا" بڑھاپے میں باتیں کرنے سے مُراد دوبارہ تشریف لانے پر کلام کرنا ہے۔ گویا اشارہ ہے آپ کے دوبارہ تشریف لانے کا۔ اور آپ کے باہم اختلاف ونفی کرنے والے واقعات واحوال کا ذکر فرمایا کہ آپ بچے ہوں گے پھر بوڑھے ہوں گے۔ اس سے یہ راہنمائی کرنا مقصود ہے کہ جس پر مختلف احوال گزریں وہ "اِلٰہ" نہیں ہو سکتا۔

وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور شائستہ لوگوں میں سے ہونگے۔
یہ "كلمة" سے تیسرا حال ہے یا چوتھا (پہلا حال وجیھًا تھا اور دوسرا ومن المقربین ویکلم الناس تیسرا) ـــ یا کلمۃ کی ضمیر فاعلی جو "يُكَلِّمُ" میں ہے اُس سے حال واقع ہوا ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ
(حضرت مریم علیہا السلام) بولیں اے میرے پروردگار کس طرح ہوگا میرے بچہ حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا۔
تعجب کی خاطر عرض کیا ــ یا اس لیے کہ یہ معاملہ عام حالات سے بعید تھا ــ یا یہ کہ آپ نے پوچھا کہ یا اللہ! یہ بیٹا شادی کرنے سے ہوگا یا بغیر اس کے۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ویسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں۔
کہنے والا جبریل ہے ـــ یا اللہ تعالیٰ ہیں اور جبریل نے اُسے آپ سے بیان کر دیا۔

إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ جب کسی چیز کو پُورا کرنا چاہتے ہیں تو اُسے کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا، بس وہ ہو جاتی ہے۔

یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے کہ اشیاء کو مادے سے اور اسباب کے ساتھ بالتدریج پیدا کر دے اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اُنہیں بغیر اسباب وعلل کے یکبارگی پیدا کر دے۔

وَنُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ

اور ہم تعلیم فرمائیں گے اُنہیں (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توراۃ اور انجیل۔

یہ نئی بات ہے جو اُن کے دل کو تسکین وتسلّی دینے کی خاطر کہی گئی اور اُن کے اس فکر کو مٹانے اور دُور کرنے کی خاطر جو اُنہیں خوفِ ملامت سے لاحق ہو گیا تھا کیونکہ اُنہیں علم ہو گیا تھا کہ وہ شادی کیے بغیر بچہ جنیں گی ـــــ یا (یہ نیا کلام نہیں بلکہ) يُبَشِّرُكِ پر عطف ہے (پھر یہ بھی گویا بشارت کی باتوں میں سے ایک بات ہو گی) ـــــ یا وَجِيهًا پر عطف ہے۔ (اس صورت میں بھی گویا یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ وہ صاحب وجاہت ہونگے اور ہم اُنہیں کتاب وحکمت سکھائیں گے) ـــــ اور الکتاب کا معنی ہے لکھنا یا جنسِ کُتبِ منزّلہ یعنی کتب آسمانی مُراد ہیں اور اس صورت میں پھر توراۃ وانجیل کا خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا کہ اُنہیں (قرآن مجید سے پہلے) تمام کتابوں پر فضیلت حاصل تھی ـــــ اور نافع اور عاصم نے (نُعَلِّمُهُ کی بجائے) يُعَلِّمُهُ (واحد مذکر غائب کا صیغہ) پڑھا ہے۔

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ اور اُنہیں (تمام) بنی اسرائیل کی طرف بھیجیں گے (پیغمبر بنا کر) کہ میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں۔

منصوب ہے کسی فعل کی وجہ سے جو چھپا ہوا ہے جس سے مراد قول وغیرہ ہے۔ گویا اصل عبارت یوں تھی وَيَقُولُ أُرْسِلْتُ رَسُولًا یعنی اور آپ کہیں گے میں رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یا اس کا عطف ہے ... پر بیان کردہ احوال پر جن میں نطق کا معنی پایا جاتا ہے گویا یوں فرمایا وَمُتَكَلِّمًا بِأَنِّي قَدْ جِئْتُكُم (آپ کہیں گے کہ میں تمہارے پاس نشانیاں لے کر آیا ہوں) اور بنی اسرائیل کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ آپ خاص طور پر انہی کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ تردید ہے اس شخص کی جو گمان کرتا ہو کہ آپ کو بنی اسرائیل کے علاوہ اوروں کی طرف (بھی) بھیجا گیا۔

أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے لیے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے۔

یہ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم کا بدل واقع ہو کر منصوب ہے (کیونکہ وہ مفعول تھا) —— یا یہ آیۃ سے بدل ہے اور مجرور ہے —— یا اس سے پہلے ھی مبتدا محذوف ہے اور یہ خبر مرفوع —— معنی یہ ہوگا کہ میں تمہارے سامنے اندازہ کرتا ہوں اور کسی چیز کی پرندے کی طرح تصویر بناتا ہوں۔ اور نافع نے اسے (أَنِّي کی بجائے) إِنِّي (بالکسرۃ) پڑھا ہے۔

فَأَنْفُخُ فِيهِ پھر اس کے اندر پھونک مار دیتا ہوں۔

(فیہ کی ضمیر کَهَيْئَةِ میں "كَ" کے لیے ہے یعنی اس پرندے کی مماثل چیز میں (پھونک مارتا ہوں)۔

فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ جس سے وہ (جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے۔

یعنی وہ اللہ کے حکم سے زندہ اور اڑنے والا ہو جاتا ہے۔ إذن کا ذکر

کرتے ہوئے بتا دیا کہ اُس پرندے وغیرہ کا زندہ کرنا اصل میں اللہ ہی کی جانب سے ہے نہ کہ خود اُن سے ــــ اور نافع نے یہاں بھی اور سورۃ مائدہ میں بھی طَیْرًا کی بجائے طَائِرًا پڑھا ہے۔

وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادرزاد اندھے اور برص (جذام) کے بیمار کو۔

اَکْمَه سے مراد پیدائشی اندھا ہے ــــ یا جس کی آنکھیں ضائع ہو گئی ہوں ــــ روایت ہے کہ اُن کے پاس ہزاروں مریض جمع ہو جاتے تھے۔ جو طاقت رکھتا چل کر آپ کے پاس آجاتا اور جو چل کر نہ آسکتا سیدنا عیسٰی علیہ وعلی نبینا السلام چل کر اُس کے پاس آجاتے اور آپ صرف دُعا سے ہی علاج فرماتے تھے۔

وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ اور زندہ کر دیتا ہوں مُردوں کو خدا کے حُکم سے۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ کو دوبارہ لائے ہیں تاکہ لاہوتیت کا وہم دُور کر دیا جائے کیونکہ (مُردوں کو) زندہ کرنا افعالِ بشریہ کی قبیل سے نہیں۔ (لاہوت عبرانی لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور انسان کے لیے ناسوت استعمال ہوتا ہے)

وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کر) آتے ہو اور جو رکھ آتے ہو۔

یعنی تمہارے ایسے چھپے ہوئے احوال بتاتا ہوں جن میں تم شک نہیں کر سکتے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ بے شک ان میں (میری نبوت کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لیے اگر تم ایمان لانا چاہو۔

مؤمنین کا معنی ہے جسے ایمان کی توفیق دی جائے کیونکہ جسے توفیق نہ دی

جائے اُسے معجزات بھی فائدہ نہیں دے سکتے ___ یا[۲] اس کا معنی ہے حق کی تصدیق کرنے والے، بُغض وعناد نہ رکھنے والے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ اور مَیں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہُوں اُس کتاب کی جو مجھ سے پہلے تھی یعنی توراۃ کی۔

اس کا عطف رسولاً پر ہے اور منصوب ہے انہی دُو[۱] وجہوں[۲] کی بناء پر جن کا وہاں ذکر ہوا [یعنی ۱- اَرْسِلتُ مصدِّقًا لما بین ___ پڑھا جائے۔ ۲- نَاطِقاً مُصَدِّقًا لما بین یدیّ سمجھا جائے ___ پہلی صورت میں مصدقاً حال ہوگا اور دوسری صورت میں مفعول (ناطقاً کا)] ___ یا[۳] یہ مفعول ہے فعل مضمر کی وجہ سے جس پر "قَدْ جِئتُکم" دلیل ہے، یعنی اس کے شروع میں بھی جِئتُکُم محذوف مانیں گے۔ (میں تمہارے پاس مصدّق ہو کر آیا ہوں)۔

وَلِأُحِلَّ لَكُمْ اور اس لیے آیا ہُوں کہ تم لوگوں کے لیے حلال کر دوں۔

کسی[۱] چھپے ہوئے جملے کے ساتھ مقدر ہے جیسے وجئتکم لِاُحِلَّ لَکُم وغیرہ ___ یا اس قول قَدْ جِئتُکُم بایۃ پر اسے لوٹایا جائے گا (عبارۃ یوں ہوگی جِئتُکم بایۃٍ ای لِاُظْهِرَ لکم اٰیۃً وَلِاُحِلَّ لکم۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مفعول لہٗ کا عطف مفعول بہٖ پر نہیں ہو سکتا۔ اب دونوں مفعول لہٗ ہو جائیں گے۔ اور اگر مفعول لہٗ کا عطف مفعول بہٖ پر جائز قرار دیا جائے تو پھر عبارۃ اصل یوں ہوگی جِئتُکم باٰیۃ وجِئتُکم لِاُحِلَّ لکم ___ بایۃ مفعول بہٖ ___ لِاُحِلَّ لکم مفعول لہٗ) ___ یا[۲] اس کا عطف مُصَدِّقاً کے معنی پر ہے (یعنی تصدیق کرنے کے لیے اور حلال کرنے کے لیے) جیسے کہتے ہیں جِئتُكَ مُعتَذِرًا وَلِاُطِيبَ قَلبَكَ ___ (یہاں معتذرا کے معنی پر لِاُطیبَ کا عطف ہے یعنی لِاَعتَذِرَ لَكَ وَلِاُطِيبَ ___ میں تیرے پاس

عذرخواہی اور تیرے دل کو خوش کرنے کے لیے آیا ہوں ــــ معنوی لحاظ سے ہم عطف اس لیے کہتے ہیں کہ اِسم پر فعل کا عطف نہیں ہو سکتا ــــ)

بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ بعض ایسی چیزیں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں۔

یعنی جو شریعتِ موسیٰ علیہ السلام میں حرام کیا گیا تھا جیسے چربی، آنتوں پر لگی ہوئی چربی، مچھلی، اونٹ کا گوشت اور ہفتے کے دن کام کاج کرنا ــــ اور اس میں دلیل ہے کہ آپ کی شریعت شریعتِ موسویہ کی ناسخ تھی اور اس سے توراۃ کے مصدِّق ہونے میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا جس طرح قرآن مجید کے بعض حصوں کا دوسرے بعض حصوں کا منسوخ کر دینا تناقض (ضد) اور تکاذب (باہم جھوٹ) وغیرہ کو لازم نہیں کیونکہ حقیقت میں نسخ تو کسی بات کی وضاحت اور زمانوں اور مواقع کی تخصیص کے لیے ہوتا ہے۔

وَ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ اور میں تمہارے پاس دلیلِ (نبوت) لے کر آیا ہوں حاصل یہ کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ بے شک اللہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں سو تم لوگ اُس کی عبادت کرو بس یہ ہے راہِ راست۔

یعنی میں تمہارے پاس ایک اور نشانی بھی لے کر آیا ہوں جسے تمہارے پروردگار نے میرے دل میں ڈالا ہے اور وہ یہ ہے جو میں کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی ــــ کیونکہ یہی وہ نشانی ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام میں مُجمع علیہ (متفق علیہ) ہے اور نبی اور جادوگر میں فرق کرنے والی ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا معجزات پرندے وغیرہ بنانا تو جادوگر بھی کرتے رہتے ہیں مگر یہ بات صرف انبیاء

علیہم السلام میں ہی ہوگی) ـــ یا[۲] یہ کہ میں اس بات پر نشانی لایا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی ـــ اور فَاتَّقُوا اللّٰہ و اطیعون جملہ معترضہ ہے ـــ اور ظاہراً یہ قَدْ جِئْتُکُم ـــ دوبارہ لایا گیا ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ میں یکے بعد دیگرے کئی نشانیاں تمہارے پاس لایا ہوں جو میں تمہیں بیان کرچکا ہوں۔ (مطلب یہ ہے کہ اس جملے کا عطف ہوگا پہلے قد جئتکم پر اور اس طرح معنوی زیادتی پیدا ہوگی اور وہ ہے ان اللّٰہ ربی و ربکم یا تفصیلاً بتانے کے لیے جیسے فرمایا فارجع البصر کرّتین ـــ اور یکے بعد دیگرے آیات یں گزشتہ نشانیاں بغیر باپ کے پیدا ہونا اور پنگھوڑے میں کلام کرنا وغیرہ بھی مُراد لی جاسکتی ہیں ـــ لیکن یہ صرف لفظی طور پر دوبارہ نہیں لایا گیا بلکہ معنوی طور پر ـــ) اور پہلے جو کہا کہ آیت لے کر آیا ہوں وہ تمہید کے طور پر تھا اور دوسری نشانی سے مقصود تقریب الی الحکم ہے (یعنی فاتقوا اللّٰہ کی طرف متوجہ کرنے کے لیے) اور اسی واسطے اس پر "فاء" داخل کیا ـــ یعنی جب میں تمہارے پاس غالب معجزات اور واضح آیات لے کر آیا ہوں تو تم مخالفت کرنے میں اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اُن اُمور میں جن میں تمہیں اللہ کی طرف بلاؤں ـــ یہ کہنے کے بعد آپ نے دعوت و تبلیغ شروع کی اور ایک اجمالی قول انّ اللّٰہ ربّی و ربّکم سے اس طرف اشارہ کیا۔ اور یہی حق پر اعتقاد رکھتے ہوئے قوتِ نظریہ کو کمال تک پہنچانا ہے جس کی انتہا توحیدِ باری تعالیٰ ہے۔ اور فرمایا فَاعْبُدُوْهُ (اسی کی عبادت کرو) اور یہی قوتِ عملیہ کا کمال ہے کیونکہ یہ طاعت پر ہمیشگی کے ساتھ ہوگی جو حکم دی گئی چیز دل کا کرنا اور منع کی گئی چیز دل سے رُکنا ہے۔ پھر اس پر فیصلہ دینے دیا کہ یہ دونوں کام اُوامر کا کرنا اور مناہی سے رُکنا ہی وہ راہ ہے جسے صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے اور اس کی مثال حضور علیہ السلام کا وہ فرمان ہے کہ فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ

بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (کہہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اُس پر استقامت اختیار کر۔"
یہاں بھی "اٰمَنْتُ بِاللّٰہ" میں قوتِ نظریہ اور "استقم" میں قوتِ عملیہ کا ذکر ہے۔)

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ سوجب حضرت عیسٰی (علیہ السلام) نے اُن سے انکار دیکھا۔

یعنی جب اُن کا کفر ثابت ہو گیا جیسے حواسِ خمسہ سے کسی چیز کو معلوم کیا جاتا ہے۔ (یہاں پر احساس استعارہ ہے علم سے کیونکہ کفر محسوس نہیں کیا جاتا معلوم کیا جاتا ہے۔)

قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ تو آپ نے فرمایا "کوئی ایسے آدمی بھی ہیں؟ جو میرے مددگار ہو جائیں اللہ کے واسطے؟"

اِلَى اللّٰهِ کا معنی ہے [1] اللہ کی جانب پناہ چاہنے والا ــ یا [2] اللہ کی طرف جانے والا ــ یا [3] اللہ سے ملنے والا ــ اور [4] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِلٰی حرف جار اضافت کے معنٰی میں انصاری سے متعلّق ہو یعنی (الذین یضیفون انفسھم الی اللّٰہ) لوگ جو اپنے آپ کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں میری امداد کے سلسلے میں ــ اور [5] یہ بھی کہا گیا کہ یہاں اِلٰی بمعنی مَعَ (یعنی مَعَ اللّٰہ : اللہ کے ساتھ ہو کر) آیا ہے۔ یا [6] یہ کہ بمعنی فِیْ (فی اللّٰہ : اللہ کی رضامندی کے لیے) ــ یا [7] بمعنی لام (لِلّٰہ : اللہ کے لیے) آیا ہے۔

قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ حواریّین بولے۔

حواری اُس آدمی کو کہتے ہیں جو مخلص ہو۔ لفظ حواریّ ــ حَور سے نکلا ہے (گویا یہ حَور سے اسم نسبت علی غیر القیاس بنا ہے) اور حَور کا معنی ہے وہ سفیدی جو بالکل خالص ہو اور اسی مادے سے "حواریّات" بنا ہے۔ جو شہری عورتوں کو کہتے ہیں کیونکہ اُن کے رنگ خالص اور نکھرے ہوئے ہوتے ہیں (اور اُن کے رنگوں

میں دیہاتی عورتوں کی طرح دھوپ وغیرہ سے تغیر پیدا نہیں ہوتا) ــــ سیدنا عیسٰی علیہ السلام کے اصحاب کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ اُن کی نیتیں صاف تھیں اور اُن کے دل پاکیزہ تھے (عقیدے پاک تھے) ــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ سب شہزادے (اور اُمراء) تھے جو سفید کپڑے پہنتے تھے اُن سے سیدنا عیسٰی علی نبینا وعلیہ السلام نے یہودیوں کے خلاف مدد مانگی تھی اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ لوگ دھوبی تھے جو کپڑے سفید کرتے یعنی دھوتے تھے۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کہ ہم ہیں مددگار اللہ (کے دین) کے۔

اللہ کے مددگار یعنی اُس کے دین کے مددگار ہیں۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ اس کے گواہ رہیے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

اور قیامت کے دن جب تمام رسول اپنی امتوں کے حق میں یا اُن کے خلاف گواہی دیں گے آپ ہمارے حق میں گواہی دے دیجیے۔

رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ اے ہمارے ربّ ہم ایمان لے آئے ان چیزوں (یعنی احکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی کی ہم نے (ان) رسول کی سو ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجیے جو تصدیق کرتے ہیں۔

وہ[۱] جو تیری توحید کی گواہی دیتے ہیں اُن کے ساتھ ہمیں درج فرمالیجیے ــــ یا[۲] یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو اپنے پیروکاروں کی گواہی دیں گے ــــ یا شاہدین[۳] سے مُراد امتِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے کیونکہ یہ امت تمام گزشتہ امتوں پر گواہ ہوگی ــــ تو ہمیں اُن کے ساتھ لکھ دے۔

وَمَكَرُوْا اور اُن لوگوں نے خفیہ تدبیر کی۔

(یعنی خُفیہ تجویز سوچی) جن سے سیدنا عیسٰی علیہ السلام نے کفر محسوس کیا تھا اور وہ یہود میں سے تھے اُنھوں نے تجویزیں کی کہ ایک آدمی کو مقرر کر دیا کہ وہ گھات میں رہے اور (جب بھی) حضرت عیسٰی کو (اکیلا پائے تو) فوراً قتل کر دے۔

وَمَكَرَ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ نے خفیہ تدبیر فرمائی۔

اللہ کی خُفیہ تجویز یہ تھی کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اُٹھا لیا اور جو شخص آپ کو دھوکے سے قتل کرنا چاہتا تھا اُس پر آپ کی شکل ڈال دی یہاں تک کہ اُسے قتل کر دیا گیا۔ اور "مَکر" اصل میں حیلے کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسرے کو نقصان کی طرف کھینچ لایا جاتا ہے۔ اور اس کو اللہ سے نسبت نہیں کیا جا سکتا سوائے مقابلہ اور ازدواج کی صورت کے ـــ (یعنی یہاں دشمنانِ نبی کے مکر کے مقابلے پر یہ لفظ ایسا لایا گیا)۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں۔

اللہ خفیہ تدبیر میں اُن سے قوی تر ہے اور اُن کو نقصان پہنچانے پر زیادہ قادر ہے اور ایسی صورتیں پیدا کر سکتا ہے جن کا اُنھیں گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِذْ ظرف ہے مَكَرَ اللّٰهُ کا (یعنی اللہ نے خفیہ تدبیر کی تھی جب یہ کہا تھا) ـــ یا خَيْرُ الماکرین کا ظرف ہے (یعنی اللہ تعالیٰ تمام خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بڑھ کر ہیں اُس وقت جب اللہ نے یوں فرمایا تھا) ـــ یا یہ ظرف ہے کسی چھپے ہوئے فعل کا جیسے ہم کہیں وَقَعَ ذَالِكَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ (کہ یہ اُس وقت وقوع پذیر ہوا جب اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ـــ)

يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ اے عیسٰی (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تمہیں

(وقتِ موعود پر بہ قربِ قیامت) وفات دینے والا ہوں۔

یعنی تیری عمر پوری کروں گا اور تجھے تیری مقررہ مدت (عمر) تک ڈھیل دوں گا جبکہ تجھے ان دشمنوں کے قتل سے بچالوں گا ۔۔۔ یا یہ کہ تجھے زمین سے اپنے قبضے میں کرلوں گا جیسے آپ کہتے ہیں تَوَفَّیْتُ مَالِی ۔ (میں نے اپنا مال قبضے میں لے لیا) ۔۔۔ یا یہ کہ آپ کو بحالتِ نیند اٹھا لینے والا ہوں جیسا کہ روایت کیا گیا کہ آپ کو سوتے میں اٹھا لیا گیا ۔۔۔ یا یہ کہ آپ سے بشری خواہشات ختم کردوں گا جن سے پرواز میں کوتاہی یعنی عالمِ ملکوت کی طرف پہنچنے میں رکاوٹ ہوتی ہو ۔۔۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے سات گھنٹے تک آپ کو موت دے دی پھر (زندہ کیا اور) آسمان کی طرف اٹھالیا اور نصاریٰ کا عقیدہ اسی روایت پر ہے۔

وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اور (فی الحال) میں اپنی طرف تمہیں اٹھائے لیتا ہوں۔

اِلَيَّ (اپنی طرف) مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنی بزرگی والی جگہ پر بلالوں گا (جہاں میں بندوں کو عزت بخشتا ہوں) اور جو فرشتوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور تمہیں اُن لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں (یعنی رسولِ عربی کی زبانی یہود کے الزامات دُور کرادوں گا۔)

یعنی آپ کو اُن کے بُرے پڑوس سے یا اُن کے بُرے ارادے سے پاکیزہ کرلوں گا اور بچالوں گا۔

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں اُنہیں غالب رکھنے والا ہوں اُن لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں روزِ قیامت تک۔

آپ کے پیروکار اُن مخالفین (کفار وغیرہم) پر دلائل کے ساتھ غالب ہوں گے

یا تلوار[۲] کے ساتھ غالب رہیں گے اکثر امور میں ـــــ اور آپ کے پیروکاروں سے مسلمان اور نصارٰی دونوں مُراد ہیں جو آپ کی نبوت پر ایمان لائے اور اب تک یہود کا غلبہ سیّدنا عیسٰی کی نبوت کا اعتقاد رکھنے والوں پر نہیں سُنا گیا اور اُن کا کوئی مستقل ملک یا سلطنت نہیں ہوئی۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ پھر میری طرف ہوگی سب کی واپسی۔

اور 'کُمۡ' کی ضمیر سے سیّدنا عیسٰی علیہ السلام، آپ کے پیروکار اور آپ کے نہ ماننے والے سبھی کو خطاب کیا ہے اور مخاطبین کو غائبین پر غالب رکھا (نہیں تو ضمیر 'ھُمۡ' بھی آسکتی تھی)

فَاَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ سو میں تمہارے درمیان (عملی) فیصلہ کردوں گا اُن اُمور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے۔

اس اختلاف سے دین کے بارے میں اختلاف مُراد ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَمَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَنُوَفِّیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ

تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ جو لوگ (ان اختلاف کرنے والوں میں) کافر تھے سو اُن کو سخت سزا دوں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اُن لوگوں کا کوئی حامی (طرفدار) نہ ہوگا اور جو لوگ مومن تھے اور انہوں نے نیک کام کیے تھے سو اُن کو آپ (اُن کے ایمان اور نیک کام کا) ثواب دیں گے۔

(پچھلی آیت میں گزرا "فَاَحۡکُمُ" میں فیصلہ کردوں گا) یہ اُسی فیصلے کی تفسیر اور تفصیل ہے (کہ کافروں کے بارے میں یہ فیصلہ ہوگا اور اہل ایمان کے بارے میں یہ فیصلہ ہوگا)۔ قاری حفص نے یہاں (فنوفیھم کی بجائے) فَیُوَفِّیۡہِمۡ (بصیغہ

واحد غائب) پڑھا ہے۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ اور اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے ظلم کرنے والوں سے۔

گزشتہ بات کو ثابت کرنے کے لیے یہ کہا گیا۔

ذٰلِکَ یہ (واقعات وغیرہ)

اشارہ ہے اس کی جانب جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کا واقعہ گزرا اور دیگر واقعات کی طرف بھی ــــ ذٰلِكَ مبتدا ہے اس کی خبر آگے ہے یعنی

نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ ہم تمہیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔

اور مِنَ الْاٰیٰتِ جو کہ (آپ کے) منجملہ دلائل (نبوت) کے ہے۔

نَتْلُوْهُ کی ضمیر غائب سے حال واقع ہوا ہے ــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِنَ الْاٰیٰت خبر ہو اور نَتْلُوْهُ علیك حال ہو اور اس میں معنیٔ اشارہ عامل ہو (یعنی ذالك کے اشارے سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے اور ذہن میں تصوّر آتا ہے وہ عامل ہے) ــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں ــــ نتلوہ علیك اور من الأیات ــــ دو خبریں ہوں ــــ اور ذالك کو (مبتدا کی بجائے) منصوب بھی کہا گیا کہ اس کے شروع میں کوئی فعل محذوف ہے اور یہ اُس کا مفعول ہے اور 'نتلوہ علیك' کو اُس کا بیان اور وضاحت مانا گیا ہے۔

وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ اور منجملہ حکمت آمیز مضامین کے ہے۔

یعنی وہ حکمت و دانائی کی باتوں پر مشتمل ہے۔ اور (حکیم بمعنیٰ مُحکَم لایا گیا) مُحکَم اُس رد کی گئی چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی خلل راہ نہ پا سکتا ہو ــــ اس سے مُراد قرآن مجید ہے ــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے مراد لوح (محفوظ) ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ بے شک حالتِ عجیبہ (حضرت) عیسٰی کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالتِ عجیبہ (حضرت) آدم کے ہے۔

خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ کہ اُن (کے قالب) کو مٹی سے بنایا۔

یہ جملہ مثال کی تفسیر کرتا ہے اور وجہ شبہ بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی بغیر باپ کے پیدا کیے گئے جس طرح آدم علیہ السلام مٹی سے بغیر باپ اور ماں کے پیدا کیے گئے۔ جو زیادہ عجیب و غریب ہے اُس کے ساتھ تشبیہ دی تاکہ مخالف کو لاجواب کیا جائے اور اس لیے کہ شُبہ کے جتنے عنوان ہوسکتے ہیں اُن کو ختم کر دیا جائے۔ اور معنٰی یہ ہے کہ اُن (آدم علیہ السلام) کا قالب (ڈھانچہ) مٹی سے پیدا کیا۔

ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ پھر اُنہیں حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا۔

یعنی آپ کو بشر بنایا جیسے کہ ایک اور جگہ پر فرمایا ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ — {پھر ہم نے اُسے ایک دوسری تخلیقِ (وجود) بخشی} — یا یہ کہ مٹی سے آدم کی تکوین کا اندازہ کیا پھر اُسے بنا دیا — اور یہ بھی جائز ہے کہ ثُمَّ تراخی خبر کے لیے ہو نہ کہ مخبر کے لیے۔ یعنی اُسے مٹی سے بنا کر تکوین دے دی ہو مگر اس کی اطلاع اور اِخبار بعد میں دی گئی۔

فَیَکُوْنُ بس وہ (جاندار) ہو گئے۔

صیغۂ مضارع استعمال ہوا حالانکہ یہ بات تو پہلے ہو چکی ہے تو یہ اس لیے کہ اس سے گزشتہ بات کی منظر کشی کی گئی ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے۔

خبر[۱] ہے مبتدا محذوف کی یعنی اصل میں یہاں تھا ھُوَ الْحَقُّ — اور[۲] یہ بھی کہا گیا کہ الحقُّ مبتدا ہے اور اُس کی خبر ہے مِنْ رَّبِّکَ — معنٰی یہ ہوگا کہ حق

بات جس کا ذکر ہوا وہ اللہ ہی کے پاس ہے۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جیے۔

یہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب ہے آپ کو زیادہ ثابت قدمی پر اُبھارنے کے طور پر کہا گیا ــــ یا ہر سننے والے سے خطاب ہے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ پس جو شخص آپ سے عیسٰی علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے۔

یعنی اہل کتاب اگر آپ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا کریں۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ آپ کے پاس قطعی علم آنے کے بعد۔

آپ کے پاس علم آگیا یعنی ایسے دلائل اور کھلی باتیں جو علم کا موجب ہیں۔

فَقُلْ تَعَالَوْا تو آپ فرما دیجیے کہ آجاؤ۔

یعنی اپنی دلیل اور عزم کے ساتھ سامنے آؤ۔ مطلق آنا مراد نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی موجود تھے۔

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ہم (اور تم) بُلالیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو۔

یعنی ہم میں سے اور تم میں سے ہر ایک اپنی جان کو، اپنے قریبی رشتے داروں اور اپنے دل کے چہیتوں کو مباہلہ پر لے آئے اور اُنہیں مباہلہ پر اُکسائے ــــ اور اپنی جانوں پر اُن کو مقدم رکھا (یعنی اَبناء اور نِساء کا ذکر اَنفس سے پہلے کیا) کیونکہ انسان اُن کی خاطر جان کی بازی لگا دیتا ہے اور اُن کی جانب سے ہر طرح کا مقابلہ کرتا ہے۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دُعا کریں۔

یعنی پھر ہم مباہلہ کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اُس پر لعنت بھیجیں۔ اور "بُہْلَہ" باء کے فتح اور ضمہ دونوں سے ہے اس کا معنیٰ ہے لعنت کرنا اور اس کا اصل معنیٰ ہوتا ہے چھوڑ دینا۔ جیسے کہتے ہیں بَہَلْتُ النَّاقَةَ (میں نے اونٹنی کو چھوڑ دیا) جب آپ اُسے بغیر رسّی وغیرہ باندھے چھوڑ دیں۔

فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ اس طور سے کہ اللہ کی لعنت بھیجیں اُن پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں۔

(آیت میں اپنے تن سے مُراد تو خود اہلِ مباحثہ ہیں اور نساء سے خود زوجہ مراد نہیں، بلکہ اپنے گھر کی جو عورتیں ہوں جن میں دُختر بھی شامل ہے۔ چنانچہ آپ بوجہ اس کے کہ حضرت فاطمہؓ سب اولاد میں زیادہ عزیز تھیں اُن کو لائے۔ اسی طرح ابناء سے خاص صُلبی اولاد مُراد نہیں بلکہ عام ہے، اولاد کی اولاد کو بھی۔ اور جو مجازاً اولاد کہلاتے ہوں یعنی عُرفاً مثل اولاد کے سمجھے جاتے ہیں، اس مفہوم میں نواسے اور داماد بھی داخل ہیں چنانچہ آپ حضرات حسنین اور علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو لائے۔ ۱۲۔ حاشیہ از بیان القرآن تھانویؒ)۔

یہ عطف ہے جس میں اور زیادہ وضاحت کر دی گئی ہے۔ روایت ہے کہ جب اُنہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی اُنہوں نے کہا ہم سوچ لیں۔ پھر جب وہ تنہائی میں بیٹھے تو اُنہوں نے عاقب (سردار) سے جو اُن کا بڑا اور صائب الرائے تھا پوچھا کہ "اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟" تو اُس نے کہا: "بخدا تم نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کو پہچان تو لیا ہے اور وہ تمہارے نبی کے بارے میں ایک (صحیح) فیصلہ کُن بات لے کر آیا ہے۔ اللہ کی قسم جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا وہ ہلاک ہو کر رہی۔ سو اگر تم اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہتے ہو تو اس

شخص سے الگ ہو جاؤ اور واپس چلے جاؤ" ۔ چنانچہ وہ صبح کے وقت رسولِ اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے جبکہ اُس صبح آپ حضرت حسین کو گود میں لیے ہوئے تھے، حضرت حسن کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا، حضرت فاطمہ آپ کے پیچھے آ رہی تھیں اور حضرت علی اُن کے پیچھے آ رہے تھے ۔ اور آپ فرما رہے تھے "جب میں دُعا کروں تو تم "آمین" کہنا" ۔ یہ دیکھ کر اُن کے اُسقف نے کہا "اے گروہِ نصاریٰ! بلاشبہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جو اگر اللہ سے سوال کریں کہ وہ پہاڑ کو اُس کی جگہ سے ہٹا دے تو اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دے گا لہٰذا تم اُن سے مباہلہ نہ کرو ایسا نہ ہو کہ تم ہلاک ہو جاؤ" ۔ اس پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جُھک گئے یعنی آپ کی بات مان لی اور ہر سال دو ہزار حُلّے اور لوہے کی تیس زرہیں بطور جزیہ دینا قبول کیا ۔ تو رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر یہ مباہلہ کر لیتے تو ان کی شکلیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ کر دی جاتیں اور وادیِ نجران ان پر آگ برساتی اور اللہ تعالیٰ نجران کا نام و نشان مٹا دیتا یہانتک کہ درختوں پر پرندے بھی ختم ہو جاتے" ۔ اور اس واقعہ میں آپ کی نبوت کی دلیل ملتی ہے اور جو اہلِ خاندان آپ کے ساتھ تھے اُن کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

إِنَّ هٰذَا ۔ بیشک یہ (جو کچھ) مذکور ہوا۔

یعنی یہ جو حضرتِ عیسیٰ اور (اُن کی ماں) مریم کا قصّہ ذکر ہوا۔

لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وہی ہے سچّی بات۔

یہ سب حق ہے۔ "إِنَّ" کی خبر ہے یا "هُوَ" فصل ہے جو اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ جو کچھ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے بارے میں ذکر ہوا وُہی حق

ہے بخلاف اُس کے جس کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں اور (اُس کا مابعد یعنی) "القصص الحق" اُس کی خبر ہے ـــــ اور 'لام' تاکید اُس پر داخل کیا گیا کیونکہ وہ مبتدا "ھٰذا" کے زیادہ قریب ہے اور اصل میں تو اسے مبتدا پر داخل کیا جانا تھا [مگر وہاں اِنَّ حرفِ تاکید آ گیا اور دو حرف تاکید (اِنَّ اور لام) جمع نہیں ہو سکتے لہذا اُسے کلمہ فاصل ھُوَ پر داخل کیا گیا جو مبتدا کے قریب ہے}

وَمَا مِنْ اِلٰـهٍ اِلَّا اللّٰهُ اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے۔

"مِنْ" مزیدہ برائے استغراق لا کر وضاحت کر دی (کہ کوئی بھی اُلوہیت کے لائق نہیں سوا اللہ کے) اور نصارٰی جو تثلیث کے قائل ہیں اُن کی تردید میں تاکید اور زور پیدا کر دیا۔

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور بلا شک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں۔

یعنی اُس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو قدرتِ تامّہ اور حکمتِ بالغہ میں اُس کی برابری کرے تاکہ اِلٰہ ہونے میں اُس کی شریک ہو سکے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ پھر (بھی) اگر سرتابی کریں تو بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد والوں کو۔

یہ اُن (اہلِ کتاب) کے لیے وعید ہے ـــــ اور اسم ضمیر کی بجائے اسم ظاہر (المفسدین) کہا تاکہ دلیل دی جائے کہ دلائل سے پیٹھ پھیرنا اور توحید سے اعراض کرنا دین اور اعتقاد کے لیے بڑا فساد پیدا کرنا ہے اور یہ فسادِ نفس بلکہ فسادِ عالم کی طرف پہنچا دیتا ہے۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ آپ فرما دیجیے کہ اے اہلِ کتاب۔

اس سے دونوں اہلِ کتاب مذاہب یعنی یہود و نصارٰی مراد ہیں ـــــ یا

وفد نجران مُراد ہے ۔۔۔ یا [۳] یہود مدینہ ۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مُسلّم ہوتے ہیں) برابر ہے ۔

(یعنی اُس بات پر عمل کرو) جس میں نہ انبیاء کا اختلاف ہے نہ کتبِ سماویہ کا ۔۔۔ اور اس کلمہ کی تفسیر اس کا مابعد کرتا ہے یعنی

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ یہ کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں ۔

یہ کہ ہم اُسے عبادۃ میں ایک مانیں اور خالص اُسی کی عبادت کریں ۔

وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں ۔

یعنی عبادت کے مستحق ہونے میں ہم اُس کے سوا کسی کو اُس کا شریک نہ بنائیں اور نہ کسی کو اس بات کا اہل سمجھیں کہ اُس کی عبادت کی جائے ۔

وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ۔

یعنی ہم یہ بھی نہ کہیں کہ عُزَیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور یہ بھی نہ کہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور علماء کی پیروی نہ کریں اُن باتوں میں جو اُنہوں نے حلال و حرام کے سلسلے میں گھڑ لی ہیں کیونکہ اُن میں سے ہر ایک ہم میں سے ایک ہے ہماری مانند بشر ہے ۔۔۔ روایت ہے کہ جب آیۃ اتخذوا احبارھم و رُھبانھم اربابا من دون اللہ ۔ (انہوں نے اپنے علماء اور راھبوں کو رب بنالیا ہے اللہ کو چھوڑ کر) نازل ہوئی تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا : "اے خدا کے رسول ! ہم اُن کی عبادت تو نہیں کرتے تھے (وہ رب کیسے ہوئے) ؟" آپ نے فرمایا : "کیا وہ تمہارے لیے حلال اور حرام نہیں بتلاتے تھے

پھر تم اُن کا کہا مان لیتے تھے؟" عرض کیا: "ہاں! (ایسا تو تھا)" فرمایا: "یہی بات ہے (جسے اربابا من دون اللہ سے تعبیر کیا گیا)"

فَإِنْ تَوَلَّوْا پھر اگر وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں۔

یعنی اگر وہ توحید سے منہ پھیر جائیں۔

فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ تو تم لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

یعنی حُجّت تم پر پوری ہو گئی لہٰذا اب[1] تم ہماری نسبت اعتراف کرو کہ ہم اسلام لانے والے ہیں تمہیں چھوڑ کر (یعنی صرف ہم ہی مسلمان ہیں) ــــ یا[2] یہ کہ تم اعتراف کرو کہ "تم کافر ہو" اُن مسائل سے (انکار کرتے ہو) جن پر کتابیں گویا ہیں اور انبیاء علیہم السلام اُن (مسائل) کو برابر طور پر مانتے ہیں ــــ (جیسے دو میں سے ایک جیتنے والا ہارنے والے کو کہتا ہے کہ تو کہہ دے کہ تم جیت گئے گویا اُس سے اُس کی اپنی ہار تسلیم کراتا ہے۔ اسی طرح یہاں اُن سے اُن کے کفر کا اقرار کرانا مقصود ہے ۱۲)۔

تنبیہ: دیکھیے اس قصّے میں کتنی رعایتیں رکھی ہیں نیکی کی راہ دکھانے میں مبالغہ اور زور دینے میں اور یکے بعد دیگرے دلائل لانے میں۔ پہلے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احوال اور اُن مختلف اطوار کا ذکر کیا جو خُدا ہونے کے مُنافی ہیں (جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا، پنگھوڑے میں بولنا، وجیہہ ہونا اور رسول ہونا اور اس قسم کی دیگر باتیں) ــــ پھر ایسی باتوں کا ذکر فرمایا جس سے اُن کی مشکل حل ہو جائے اور اُن کا شبہ دُور ہو جائے (جیسے فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَ اللہِ کَمَثَلِ اٰدَم) پھر جب اُن کے ضد و عناد کو دیکھا تو اُنہیں مباہلہ کی دعوت دی گویا اُنہیں (ہر طرح سے) عاجز کر دیا۔ پھر جب اُنہوں نے اس سے اعراض کیا اور تھوڑا سا مان

گئے (کہ جو یہ دین قبول کیا) اسے پہلے انہیں پھر صحیح راہ کی طرف بلایا اور ایسا طرز کلام اختیار کیا جو نہایت آسان مگر بات منوانے کے لیے لازم ہے کہ انہیں اس بات کی طرف دعوت دی جس پر حضرت عیسیٰ اور انجیل اور باقی تمام انبیاء اور آسمانی کتابیں متفق ہیں (یعنی فرمایا قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم) پھر جب اس سے بھی انہیں فائدہ نہ ہوا اور یقین ہو گیا کہ معجزات بھی اور دھمکیاں بھی انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتیں تو آپ سے منہ موڑ لیا اور فرمایا تم گواہی دے دو ہم مسلمان ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ اے اہل کتاب کیوں حجت کرتے ہو (حضرت) ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں نازل کی گئی توراۃ اور انجیل مگر اُن کے (زمانہ کے بہت) بعد۔

یہود اور نصاریٰ میں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا ہو گیا اور ہر ایک فریق نے دعویٰ کیا کہ وہ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) اُن میں سے تھے۔ چنانچہ وہ جھگڑا آنحضور علیہ السلام کے پاس لے گئے اس پر یہ آیۃ نازل ہوئی۔۔۔ اور معنی یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت تو توراۃ و انجیل کے جناب موسیٰ اور جناب عیسیٰ پر نازل ہونے کے بعد وجود میں آئیں اور ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ سے ایک ہزار سال اور حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال پہلے تھے تو پھر وہ ان مذاہب پر کیونکر ہو سکتے تھے (جبکہ ان کا ابھی وجود ہی نہ تھا) {یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ اور آپ سے ایک ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم تھے۔ گویا حضرت عیسیٰ سے حضرت ابراہیم تین ہزار سال پہلے تھے۔ حاشیہ ۱۲}

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا پھر سمجھتے نہیں ہو۔
(اگر تمہیں عقل ہو) تو ایسی محال بات کو چھوڑ دو۔

هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ہاں تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں تو حجت کر ہی چکے جس سے کسی قدر تو واقفیت تھی سو ایسی بات میں کیوں حجت کرتے ہو جس سے تمہیں اصلاً واقفیت نہیں۔

ھَا حرفِ تنبیہ ہے جس سے اُنہیں اس بات پر خبردار کرنا مقصود ہے جس سے وہ غافل ہو چکے ہیں ـــــ أَنْتُمْ مبتدا اور هٰؤُلَاءِ اُس کی خبر ہے۔ حَاجَجْتُمْ دوسرا جملہ ہے جو پہلے کی وضاحت کرتا ہے یعنی تمہی وہ بیوقوف ہو اور تمہاری حماقت کا بیان یہ ہے کہ تم نے جھگڑا کیا ہے ایسی باتوں میں جن کا تمہیں علم ہے تم نے اُنہیں توراۃ و انجیل میں لکھا پایا ہے مگر عناد (کی وجہ سے تم نے جھگڑا کیا) ہے یا یہ کہ تم توراۃ و انجیل میں اُس کے وارد ہونے کا دعویٰ کرتے ہو (حالانکہ ایسا نہیں ہے) پھر تم اُن باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں اور نہ اُس کا کوئی ذکر ہے تمہاری کتابوں میں یعنی دینِ ابراہیم کا ـــــ اور[۲] یہ بھی کہا گیا ہے کہ هٰؤُلَاءِ بمعنی الَّذِيْنَ ہے (گویا یہ اسم موصول ہے) اور حَاجَجْتُمْ اُس کا صلہ ہے۔ اور ـــــ بعض[۳] نے کہا کہ هٰأَنْتُمْ اصل میں أَأَنْتُمْ ہے یعنی ہمزہ استفہام کا ہے جو اُن کی حماقت سے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر اس ہمزۂ (استفہام) کو ھَا سے بدل دیا۔

اختلافِ قراءت : اور نافع اور ابو عمرو نے هَآنْتُم بغیر ہمزہ کے مدّ سے پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اور ـــــ ورش (لقب عثمان ابن سعید نے مدّ کو چھوٹا کیا ہے اور (قاری محمد بن عبدالرحمٰن الملقّب بہ) قنبل نے ہمزہ تو پڑھا ہے

مگر "الف" جو ھا کے بعد ہے اُسے چھوڑ دیا ہے اور باقی قُرّا نے مدّ اور ہمزہ دونوں کے ساتھ پڑھا ہے ــــ اور بزّی نے کہا کہ اسے مدّ کو چھوٹا کر پڑھا جائے اُس نے کہا اصل یہی ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

یعنی جو کچھ تم حضرت ابراہیم کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔

وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور تم نہیں جانتے۔

یعنی اس حال میں تم حقیقت سے بے خبر ہو۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے۔

دلائل سے جو بات پہلے ثابت کی اب اُسی مقصود کو واضح کر دیا ہے۔

وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا لیکن (البتہ) طریقِ مستقیم والے۔

یعنی وہ غلط اور باطل عقائد سے دُور تھے۔

مُّسْلِمًا (یعنی) صاحبِ اسلام تھے۔

یعنی اللہ کا فرمانبردار اور اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ وہ ملّتِ اسلام پر تھے (یعنی شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام جو بعد میں نازل ہوئی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اِسی کے پابند تھے) یُوں تو پھر وُہی الزام (ہم پر) عائد ہو گا۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔

اس میں اُن (یہود و نصارٰی) پر تعریض (چوٹ) ہے کہ وہ مشرک ہیں بوجہ اس کے کہ اُنہوں نے عُزیر علیہ السلام اور مسیح علیہ السلام کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا ہے ــــ اور اس میں مشرکین کے اس دعوے کا ردّ ہے جو وہ کہتے تھے کہ ہم ملّتِ ابراہیم پر ہیں۔

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم کے ساتھ۔

یعنی اُن میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ خاص (تعلق رکھنے والے) اور زیادہ قرب رکھنے والے ــــ اَوْلٰی "ولی" سے بنا ہے جس کا معنٰی ہے قُرب۔

لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اُن کا اتباع کیا تھا اُن کی امّت میں سے۔

وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور یہ ایمان والے۔

کیونکہ اصولی اعتبار سے ان کی شریعت اکثر امور میں آپ کی شریعت کے موافق ہے ــــ اور النبیّ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں اس کا عطف اتَّبَعُوْهُ کی ضمیر منصوب "ہ" پر ہوگا (معنٰی یہ ہوگا کہ جنہوں نے پیروی کی حضرت ابراہیم کی اور اس نبی کی ہے) ــــ اور اسے جرّ کے ساتھ النَّبِيِّ بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں اس کا عطف بِإِبْرَاهِيمَ پر ہوگا (اور معنٰی یہ ہوگا ــــ کہ زیادہ قریب رکھنے والے لوگوں میں سے حضرت ابراہیم کے ساتھ اور آنحضور علیہ السلام کے ساتھ)۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرے گا اور اُن کے ایمان کی بدولت اُن کے اچھے اعمال کی (بھلی) جزاء دے گا (کہ انہوں نے بہترین طور پر سیدنا ابراہیم کی پیروی کی) ــــ

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ دل سے چاہتے ہیں بعض لوگ، اہلِ کتاب میں سے اس امر کو کہ تمہیں (یعنی حق سے) گمراہ کر دیں۔

یہ اُن یہود کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے حضرت حذیفہ، حضرت عمار اور حضرت معاذ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کو یہودیت کی دعوۃ دی تھی ـــــ
یہاں "لَوْ" (شرطیہ) "اَنْ" مصدریہ کے معنیٰ میں ہے۔

وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ اور وہ کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے مگر خود اپنے آپ کو۔

اور اُن کا گمراہ کرنا اُن (مسلمانوں) کو کوئی نقصان نہ دے گا اور اُس کا وبال اِن (یہود) پر ہی پڑے گا کیونکہ اس گمراہ کرنے کی کوشش کی سزا میں اُن کا عذاب دوگنا کر دیا جائے گا ـــــ یا یہ معنیٰ ہے کہ وہ اپنے جیسوں کو ہی گمراہ کر پاتے ہیں۔
{انفسہم : امثالہم}

وَمَا يَشْعُرُوْنَ اور اس کی اطلاع نہیں رکھتے۔

یعنی اس کا بوجھ (اور گناہ) نہیں سمجھتے کتنا ہوگا اور اُس کے نقصان کو جو اُنہی سے مخصوص ہے نہیں سمجھتے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اے اہلِ کتاب کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ۔

یعنی اُن آیات کو کیوں نہیں مانتے جو توراۃ و انجیل میں رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت پر شاہد (عدل) ہیں اور دلالت کرتی ہیں۔

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ حالانکہ تم اقرار کرتے ہو۔

یعنی تم اِن توراۃ و انجیل کی آیات کے منزّل من اللہ ہونے کو مانتے ہو ـــــ یا یہ کہ تم قرآن مجید کا اقرار کرتے ہو اور تم اپنی دونوں کتابوں میں حضور علیہ السلام کی تعریف موجود پاتے ہو ـــــ یا یہ کہ تم معجزات کے ذریعے جانتے ہو کہ یہ (قرآن کریم یا رسول کریم) حق ہے۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تَلۡبِسُونَ ٱلۡحَقَّ بِٱلۡبَٰطِلِ اے اہلِ کتاب
کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی (مضمون یعنی نبوتِ محمدیہ) کو غیر واقعی سے۔
یعنی[1] حق کی تحریف کرکے باطل کے ساتھ ملاتے ہو۔۔۔ اور باطل کو حق کی صورت
دے کر ظاہر کرتے ہو۔۔۔ یا[2] یہ کہ حق و باطل میں جو تمیز کرنے والی آیات تھیں اُن کو
ملا جُلا دیتے ہو کہ پھر انسان فرق کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

اختلافِ قراءت: اور یہاں تلبّسون باء کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا
گیا ہے تاکہ اس میں زور پیدا کیا جائے۔۔۔ اور تَلبَسُون باء کی فتح سے (بغیر
تشدید) بھی پڑھا گیا ہے یعنی تم حق کو باطل کا لباس پہنا دیتے ہو جیسے آنحضور علیہ السلام
نے فرمایا (المتشبع بما لم یعطه) كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ

وَتَكۡتُمُونَ ٱلۡحَقَّ اور چھپاتے ہو واقعی بات کو۔
(الحق سے مُراد) آپ کی نبوت اور آپ کی صفات ہیں جن کا ذکر توراۃ و
انجیل میں آیا ہے۔
وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ حالانکہ تم جانتے ہو (کفر قبیح ذاتی ہے جو کسی حال میں
جائز ہو ہی نہیں سکتا مگر اقرار اور علم کے وقت کفر اور زیادہ قابلِ ملامت ہے)
یعنی تم جو کچھ چھپاتے ہو خود اسے جانتے بھی ہو۔
وَقَالَت طَّآئِفَةٌ مِّنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ ءَامِنُواْ بِٱلَّذِيٓ
أُنزِلَ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَجۡهَ ٱلنَّهَارِ اور بعض
لوگوں نے اہلِ کتاب میں سے کہا کہ ایمان لے آؤ اس پر جو نازل کیا گیا ہے مسلمانوں
پر (یعنی قرآن پر) شروع دن میں۔
یعنی دن کے پہلے حصے میں قرآن پر ایمان لانے کا اظہار کرو۔۔۔ (دن کے

پہلے حصے کو وجهَ النهار (دن کا چہرہ) اس لیے کہا کہ یہ (اس کا) حسین ترین اور خوب ترین حصہ ہوتا ہے اور اس لیے کہ رات کے بعد یہ پہلے ظاہر ہوتا ہے۔ حاشیہ ۱۲}

وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ اور (پھر) انکار کر بیٹھو آخر دن میں یعنی شام کو کیا عجب وہ پھر جائیں۔

اور دن کے آخر حصے میں قرآن مجید کا انکار کر دو تاکہ وہ بھی اپنے دین میں شک کرنے لگیں یہ دیکھ کر کہ تم کسی ایسے نقص کی وجہ سے پھر گئے ہو جو تمہیں ظاہر ہوا ہے ـــــ اور طَآئِفَةٌ (گروہ) سے مُراد کعب بن الاشرف اور مالک بن الضیف ہیں جنہوں نے تحویلِ قبلہ کے موقع پر اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ اُس بات پر جو اُن پر قبلہ رُخ ہوکر نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی ایمان لے آؤ اور دن کے پہلے حصے میں اُدھر منہ کرکے نماز بھی پڑھو پھر آخر دن میں (اُسی) چٹان کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو (جو بیت المقدس میں مخصوص تھی) شاید یہ (مسلمان) کہنے لگیں کہ "یہ (یہود) تو ہم سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں اور وہ لوٹ گئے ہیں" ہو سکتا ہے نتیجتاً وہ بھی پھر جائیں ـــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ خیبر کے بارہ علمائے یہود نے آپس میں مشورہ کیا کہ وہ دن کے ابتدائی حصے میں اسلام میں داخل ہو جائیں اور آخر حصہ میں کہیں کہ "ہم نے اپنی کتاب (توراۃ) میں غور کیا ہے اور اپنے علماء سے مشورہ کیا ہے تو ہم نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو اُس صفت سے متصف نہیں پایا جس کا ذکر توراۃ میں ہوا ـــــ" ہو سکتا ہے اس طرح آپ کے اصحاب شک میں پڑ جائیں (اور دین سے پھر جائیں)۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اور صدقِ دل سے کسی کے روبرو اقرار مت کرنا مگر ایسے شخص کے روبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو۔

یعنی دلی تصدیق کے بارے میں اقرار نہ کرو سوائے اپنے ہم مذہب بھائیوں

کے ــــ یا یہ کہ دن کے پہلے حصے میں اپنا (جھوٹ موٹ) ایمان لانا ظاہر نہ کرو سوائے اُن کے جو تمہارے ہی دین پر ہوں کیونکہ (جنہیں تم ظاہر کروگے) اُن کا لوٹنا تو زیادہ متوقع اور زیادہ غور طلب ہے۔

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے کہ یقیناً ہدایت اللہ کی ہے۔

جسے چاہتا ہے ایمان کی طرف ہدایت کرتا ہے اور ایمان پر ثابت قدمی کی توفیق دیتا ہے۔

اَنْ يُّؤْتٰى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ ایسی باتیں اس لیے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی۔

یہ محذوف سے متعلق ہے جیسے دَبَّرْتُمْ ذَالِكَ وَ قُلْتُمْ ــــ اَنْ يُّؤْتٰى (تم نے غور و خوض کیا اور پھر تدبیر کے بعد کہا ــــ اَن یوتی الخ) [اس بنا پر یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہوگا اور دوسری صورت جو آگے آ رہی ہے اُس سے یہ طائفۃ (گروہ) کے قول میں شامل ہوگا۔ حاشیہ ۱۲] اور معنی یہ ہوگا کہ حسد نے تمہیں اس بات پر اُبھارا ہے ــــ یا یہ لَا تُؤْمِنُوْا سے متعلق ہے یعنی تم اپنا ایمان اس بات پر کہ تمہاری مانند کسی اور کو بھی (کتاب سے) نوازا جا سکتا ہے ظاہر نہ کرو سوا اپنے ہم مشرب لوگوں کے اور یہ بات مسلمانوں کو ظاہر نہ کرو کہ یہ اُن کی ثابت قدمی اور پختگی کو بڑھا نہ دے اور نہ یہ بات مشرکین کو ظاہر کرو کہ اس سے وہ اسلام کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں ــــ اور اللہ کا یہ قول قُلْ اِنَّ الْهُدٰى الخ جملہ معترضہ ہے جو اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اُن کا مکر و فریب کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ــــ یا اِنَّ کی خبر ہے اَنْ يُّؤْتٰى الخ اور اس صورت میں هُدَى اللّٰه بدل ہوگا الهدیٰ سے ــــ گویا عبارت یوں ہوگی: قُل ان الهدیٰ ان یُّؤتیٰ

احَدٌ الخ { کہہ دو کہ اصل ہدایت جو اللہ کی ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ (مان لیا جائے کہ) تمہاری مانند کسی اَور کو بھی دیا جا سکتا ہے۔حاشیہ ۱۲ } ـــــ اور ابن کثیر کی قراءت میں أَنۡ یُّؤۡتیٰ استفہام کے لیے ہے کہ اس سے اُنہیں جھنجھوڑنا مقصود ہے ـــــ اور یہ پہلی توجیہ کی تائید کرتا ہے۔ یعنی کیا کوئی دیا جا سکتا ہے ؟ تم نے یہی تدبیر کی ـــــ اور یہاں (أنۡ مصدریہ کی بجائے) إِن نافیہ بھی پڑھا گیا ہے ـــــ اس صورت میں یہ اُس طائفہ ہی کا کلام ہو گا یعنی اپنے ایمان کی حقیقت صرف اپنے متبعین پر ہی ظاہر کرو اور اُن سے یہ کہو کہ تمہاری مانند کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔

اَوۡ یُحَآجُّوۡکُمۡ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ یا اَور لوگ تم پر غالب آجائیں تمہارے رب کے نزدیک۔

پہلی دو توجیہات (متعلق بمحذوف، متعلق بلا تؤمنوا) کی بناء پر یہ أن یُّؤۡتیٰ پر عطف ہے ـــــ اور تیسری توجیہ (جبکہ أنۡ یُّؤۡتیٰ کو اِنّ کی خبر قرار دیا تھا) کی بناء پر اس کا معنیٰ یہ ہوگا (کہہ دیجیے کہ ہدایت یہ ہے کہ کسی اَور کو بھی تمہاری طرح دیا جا سکتا ہے) یہاں تک کہ وہ تمہارے ساتھ (اے یہود) تمہارے پروردگار کے پاس جھگڑا کریں گے اور تمہاری حجّت کو باطل کر دیں گے ـــــ (اس صورت میں أَوۡ بمعنی إِلیٰ ہوگا۔) اور "یُحَآجُّوۡکُمۡ" میں جمع غائب کی ضمیر اَحَدٌ کے لیے آئی ہے کیونکہ یہاں اَحَدٌ جمع کے معنیٰ میں ہے کیونکہ اس سے مُراد اُن کے غیر متبعین (یعنی مسلمان) مُراد ہیں۔

قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ یُؤۡتِيۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۚ یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ (اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجیے

کہ بے شک فضل تو خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے وہ اُس کو جسے چاہیں عطا فرمائیں اور اللہ بڑی وسعت والے خوب جاننے والے ہیں، خاص کر دیتے ہیں اپنی رحمت (فضل) کے ساتھ جس کو چاہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔

اس آیت میں ایک واضح دلیل دے دی (کہ فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے) اور اس حجت اور دلیل سے اُن کے زعمِ باطل کا ردّ اور ابطال ہو گیا (کہ صرف تم ہی فضلِ الٰہی کے حقدار نہیں ہو)۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اور اہلِ کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب) اگر تم اُس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اسے تمہارے پاس لا رکھے۔

جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اُن کے پاس ایک قرشی نے ایک ہزار دو سو اوقیہ سونا امانت رکھا تو اُنہوں نے (ٹھیک ٹھیک) لوٹا دیا۔ (اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا تھا۔ آجکل اُس کی مقدار ۱۰ ⅚ درہم ہے)۔

وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَأْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اور اُنہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اُس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تمہیں ادا نہ کرے۔

جیسے فنحاص بن عازوراء — کہ اُس کے پاس ایک اور قرشی نے ایک دینار امانت رکھا مگر اُس نے اُس کی ادائیگی سے انکار کر دیا — اور یہ بھی کہا گیا کہ زیادہ چیز میں بھی امانت اور دیانت والے نصاریٰ ہیں جبکہ اُن میں امانت داری غالب ہے اور تھوڑے میں بھی خیانت کرنے والے یہود ہیں کیونکہ ان کی فطرت میں خیانت زیادہ ہے — اور حمزہ، ابوبکر اور ابوعمرو نے ضمیر مذکر غائب

"ہٗ" کے سکون سے یُؤَدِّہٖ الیک اور لَا یُؤَدِّہٗ اِلیک پڑھا ہے اور قالون نے "ہ" کے کسرہ کو اختلاس (جھپٹے) سے پڑھا۔ (جیسے یُؤَدِّہٖ اور لَا یُؤَدِّہٖ) اور ہشام سے بھی اِسی (قالون والی) روایت میں پڑھنا آیا ہے۔ اور باقی قُراء اِشباعِ کسرہ (یعنی کھڑی زیر) سے پڑھتے ہیں۔

اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْہِ قَآئِمًا مگر جب تک کہ تم اُس کے سر پر کھڑے رہو۔

(یعنی یہ لوگ امانت صرف اس حالت میں واپس کرتے ہیں) جبکہ آپ اُن کے سر پر کھڑے رہیں اور مطالبہ میں سختی کریں تقاضا کر کے اور مقدمہ دائر کر کے اور دلائل قائم کر کے۔ اس میں صاحبِ حق کو خطاب ہے۔

ذٰلِکَ یہ (امانت کا ادا نہ کرنا)

بِاَنَّھُمْ قَالُوْا اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں۔

لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ کہ ہم پر غیر اہلِ کتاب کے (مال کے بارے میں) کسی طرح کا الزام نہیں۔

یعنی ہم پر کوئی الزام اور گناہ نہیں اُن لوگوں کے مال وغیرہ کھانے کے بارے میں جو ہمارے دین پر نہیں۔

وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں۔

یعنی اُن کا یہ دعوٰی کرنا (کہ ہم پر کوئی گناہ نہیں) اللہ پر صریح جھوٹ ہے۔

وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ اور (دل میں) وہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اپنے مخالفین پر ظلم کو جائز رکھا اور یہ کہا کہ توراۃ میں اس بارے میں کوئی حُرمت وارد نہیں ہوئی ——— اور[۲] یہ بھی کہا گیا کہ قریش میں سے کچھ لوگوں سے یہود نے سودا وغیرہ کیا پھر وہ (قریش)

ایمان لے آئے اور یہود سے اپنا حق مانگا تو یہ کہنے لگے کہ تمہارا حق تو ساقط ہو گیا کیونکہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور یہود کا گمان تھا کہ اُن کی کتاب میں بھی ایسے ہی لکھا ہے ـــــ اور آنحضور علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: كَذَبَ اَعْدَاءُ اللّٰهِ ، مَامِنْ شَیْءٍ فِی الْجَاهِلِيَّةِ اِلَّا وَهُوَ تَحْتَ قَدَمَیَّ اِلَّا الْاَمَانَةَ فَاِنَّهَا مُؤَدَّاةٌ اِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ (اللہ کے دشمنوں نے جھوٹ کہا ہے، جاہلیت کی تمام رسوم و قیود میرے قدموں تلے ختم کر دی گئیں مگر امانت تو نیک و بد ہر ایک کو لوٹانا واجب ہے ـــــ الحدیث)

بَلٰى (خائن پر) الزام کیوں نہ ہو گا۔

یہ اُس بات کا اِثبات ہے جس کا اُنہوں نے انکار کیا تھا یعنی ہاں ہاں ان (یہود) پر اُن (غیر اہل کتاب) کے متعلق بھی جُرم عائد ہوتا ہے۔

مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ

جو شخص اپنے عہد کو پُورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بیشک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں ایسے متقیوں کو۔

یہ نیا جُملہ ہے جو ثابت کرتا ہے اُس جملے کو جس کا قائم مقام "بَلٰى" آیا ہے اور ضمیر مجرور (بعھدہٖ) مَنْ کے لیے ہے (یعنی جو شخص اپنا وعدہ پورا کرے) یا[1] اللہ کے لیے ہے (یعنی جو شخص اللہ کا وعدہ پورا کرے) ـــــ یہاں متقین کا عموم قائم مقام ہے اُس راجع ضمیر کا جو (مَنْ اَوْفٰى " میں مَنْ شرطیہ کی) جزاء مَنْ کی طرف راجع ہو سکتی ہے۔ { مَنْ اَوْفٰى میں مَنْ موصولہ ہے یا شرطیہ۔ المتقین ضمیر کے قائم مقام ہے اگر المتقین مَنْ اَوْفٰى کی جگہ پُر کر سکے ـــــ یا[2] یہ کہ جواب شرط محذوف ہے اور یہ فان اللہ الخ اُس پر دال ہے، اصل

عبارت یوں تھی : بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ وَاتَّقٰی یُحِبُّہُ اللّٰہُ فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ المتّقین ۔ حاشیہ ۱۲} ـــــ اور اس طرح اسم ظاہر المتّقین کو ھُمْ کی بجائے لا کر یہ بتایا گیا کہ تقویٰ پر ہی اعمال کا مدار ہے ۔ اور تقویٰ میں ہی وفاء اور دیگر واجبات کی ادائیگی اور روکی گئی چیزوں سے رُکنا بھی آجاتا ہے ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ یقیناً جو لوگ لے لیتے ہیں مقابلہ اُس عہد کے جو اللہ سے (اُنہوں نے) کیا ہے ۔

یعنی لیتے ہیں اُس عہد کے بدلے میں جو اُنہوں نے رسول پر ایمان لانے اور امانتوں کے پُورا کرنے کا کیا تھا ۔

وَاَیْمَانِھِمْ اور (مقابلہ) اپنی قسموں کے ۔

جو اُنہوں نے قسمیں اُٹھائی تھیں یہ کہہ کر وَاللّٰہِ لَنُؤْمِنَنَّ بِہٖ وَ لَنَنْصُرَنَّہٗ ـــــ خدا کی قسم ہم ضرور آپ پر ایمان لے آئیں گے اور ضرور آپ کی مدد کریں گے ۔

ثَمَنًا قَلِیْلًا معاوضۂ حقیر ۔

مطلب یہ ہے کہ متاعِ دُنیا حاصل کرتے ہیں اور وہ خواہ پوری دنیا مل جائے تو بھی تھوڑا ہی ہے ۔

اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ اُن لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ اُن سے (لطف کا) کلام فرمادیں گے ۔

یعنی اُن سے ایسا کلام نہ کریں گے جس سے وہ خوشی محسوس کریں ـــــ یا یہ کہ بالکل کلام کریں گے ہی نہیں اور قیامت کے دن فرشتے ہی اُن سے سوال و جواب کریں گے ـــــ یا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرامین اور نشانیوں سے فائدہ

نہیں اُٹھا سکیں گے ـــــ اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ (کلام نہ کرنا وغیرہ) اللہ تعالیٰ کی ناراضی کے بارے میں کنایہ ہیں کیونکہ فرمایا :

وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اور نہ اُن کی طرف (نظرِ محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز ۔

اِس لیے کہ جو شخص کسی پر ناراض ہوتا ہے اور اُسے ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اُس سے منہ پھیر لیتا ہے اور اُس سے بات نہیں کرتا اور اُس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا جیسا کہ جو شخص کسی کو کوئی اہمیت دیتا ہے تو اُس سے باتیں کرتا ہے اور اُس کی طرف بار بار نظر ڈالتا ہے ۔

وَلَا يُزَكِّيهِمْ اور نہ اُن کو پاک کریں گے ۔

یعنی اُن کی (کسی بات میں) تعریف نہیں کی جائے گی ۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا ۔

اور یہ عذابِ الیم اُن کے اپنے کیے کی بناء پر ہے ـــــ کہا گیا ہے کہ یہ آیت[1] اُن یہود علماء کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے توراۃ میں تحریف کر دی، آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفات کے ذکر اور امانتوں کے احکام وغیرہا کو بدل ڈالا اور اس پر رشوت لی تھی ـــــ اور[2] یہ بھی کہا گیا کہ جس نے بازار میں کچھ بیچنے کا سامان رکھا پھر اُس نے قسم کھائی کہ اِتنے میں خریدا ہے حالانکہ اتنے میں اُس نے نہیں خریدا تھا اُن کے بارے میں ہے ـــــ یہ[3] بھی کہا گیا کہ اُس مقدمے کے بارے میں نازل ہوئی جو اشعث بن قیس اور ایک یہودی کے مابین کسی کنوئیں یا قطعۂ[4] زمین کے بارے میں تھا اور یہودی نے قسم کھائی تھی ۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ اور بے شک اُن میں سے ۔

یعنی تحریف کرنے والوں میں سے کعب (بن الاشرف)، مالک (بن الضیف)

اور حُیَیّ (بن اخطب) جیسے بھی ہیں۔

لَفَرِيقًا يَلْوُنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ بعض ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں۔

یعنی اپنی زبانوں کو بٹ دیتے ہیں اور انہیں نازل شدہ کتاب کی بجائے تحریف شدہ کلام کی طرف موڑ دیتے ہیں پھر اُن (اپنی زبانوں) کو شبہ کتاب کی طرف مائل کر دیتے ہیں، ــــ اسے یَلُوْن بھی پڑھا گیا اس بنا، پر کہ واوٗ مضمومہ (وُ ، وْ) کو ہمزہ سے بدل دیا یَلْؤُوْن پھر تخفیف کی خاطر ہمزہ کی حرکت ساکن ماقبل (لام) کو دے دی اور اسے حذف کر دیا ــــ { یَلْوُوْن : یَلْؤُوْنَ : یَلُوْن }

لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ تاکہ تم لوگ اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزء سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جزء نہیں۔

ضمیر (منصوب) اُس تحریف شدہ کی طرف ہے جس پر پہلے دلیل دی گئی اللہ کے اس فرمان سے یَلْوُوْنَ ــــ الخ (کہ وہ زبانیں موڑتے ہیں۔) ــــ اور اسے لِیَحْسَبُوْهُ (جمع مذکر غائب کا صیغہ) بھی پڑھا گیا ہے ضمیر فاعل پھر بھی مسلمانوں کے لیے ہو گی۔

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور کہتے ہیں کہ (یہ لفظ یا مطلب) خدا کے پاس سے ہے۔ حالانکہ وہ (کسی طرح) خدا تعالیٰ کے پاس سے نہیں۔

یہ اللہ کے اس قول وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ کی تاکید ہے اور یہود کو برا بھلا کہنا مقصود ہے اور اس بات کا صراحت سے بیان ہے جو وہ گمان کرتے تھے، اشارۃً نہیں ــــ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کریم کی طرف سے نازل نہیں ہوا۔

(معتزلہ نے کہا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے افعال اللہ کے افعال یعنی تخلیق کردہ نہیں ورنہ جھوٹ اللہ پر لازم آتا ہے ــــ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بندہ کا فعل اللہ کا فعل (مخلوق) نہیں ہوتا۔ (نازل من عنداللہ نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کا فعل ہی نہیں کیونکہ کسی خاص بات کا نہ ہونا عموم کو مانع نہیں) ــــ

وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔

اس میں تاکید اور زور پیدا کیا ہے اور اُن کے خلاف ایک فیصلے کا اندراج دکھایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ایسا جان بوجھ کر کرتے ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اُسے کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرنے والوں کا ردّ اور اُن کا جھوٹا کرنا مقصود ہے ــــ (کہ ایک عام آدمی کو بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اللہ کے سوا کسی اَور کی عبادت کا حکم دے، پھر ایک نبی جسے اللہ کتاب و حکم و نبوت عطا کرے وہ ایسا کام کیسے کر سکتا ہے ــــ لہٰذا یہ سب کچھ جو تم کرتے ہو تمہاری اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ حاشیہ ۱۲) ــــ یہ بھی کہا گیا کہ ابو رافع قُرظیؓ اور سید نجرانی (انصاری نجران کا سردار) آنحضور علیہ السلام سے کہنے لگے ــــ "اے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم (حضرت عیسیٰ کی بجائے) آپ کی عبادت

کیا کریں اور آپ کو رب مانیں "۔ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ کی پناہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کریں یا ایسا حکم دیں ۔ مجھے نہ تو اللہ تعالیٰ نے ایسی بات کے لیے بھیجا ہے اور نہ مجھے ایسی بات کا حکم دیا ہے"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! ہم آپ کو بھی اسی طرح سے سلام کہتے ہیں جس طرح ہم آپس میں کہتے ہیں تو کیا (امتیاز کی خاطر یہ مناسب نہ ہوگا کہ) ہم آپ کو سجدہ کیا کریں؟" آپ نے فرمایا: "اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں لہٰذا تم ایسا نہ کرو ۔ البتہ اپنے نبی کی عزت کیا کرو اور حق اُس کے اہل یعنی حقدار کے لیے پہچانو"۔ (سجدہ اللہ ہی کے لیے ہے)

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ولیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ۔

یعنی وہ نبی تو یہی کہتا ہے کہ تم ربّانی بن جاؤ۔ ربّانی ربّ سے اسم نسبت ہے الف ونون کی زیادتی کے ساتھ، جیسے لحیانی اور رقبانی (آتا ہے) اور ربّانی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو علم وعمل میں کامل ہو۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھلاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو۔

یعنی بسبب اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کے معلّم رہے ہو اور لسے خود بھی پڑھتے رہے ہو کیونکہ پڑھنے پڑھانے کا مقصود ہو تو معرفتِ حق اور عقیدے اور عمل کی بہتری ہی ہوتا ہے ۔ ابن کثیر، نافع، ابوعمرو اور یعقوب نے تَعْلَمُوْنَ (ثلاثی مجرّد سے) پڑھا ہے یعنی تم جانتے ہو ۔ (اور تَدْرُسُوْنَ کی بجائے) تُدَرِّسُوْنَ (باب تفعیل سے) اور تُدْرِسُوْنَ (باب افعال سے) بھی پڑھا گیا ہے معنیٰ (ذہی) ہوگا (یعنی) پڑھنا ۔ جیسے اَكْرَمَ (باب افعال سے) اور كَرُمَ (ثلاثی مجرد سے)

ایک ہی معنیٰ میں آجاتے ہیں —— اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قراءتِ مشہورہ بھی اسی معنیٰ میں ہو، تب عبارت یوں ہوگی: تَدْرُسُوْنَهٗ عَلَى النَّاسِ (بسبب اس کے کہ تم اسے لوگوں پر پڑھ کر سناتے تھے)۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا اور نہ یہ بات بتلا دے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو۔

ابن عامر، حمزہ، عاصم اور یعقوب نے اسے ثُمَّ يَقُوْلَ پر عطف قرار دے کر منصوب (یعنی وَلَا يَأْمُرَكُمْ) پڑھا ہے —— اور (مَا كَانَ —— میں پہلے ہی نفی موجود ہے اب "لَا يَأْمُرَ" میں دوبارہ نفی کا 'لَا' ہوگا یہ اس لیے کہ) یہ لَا زائدہ ہے جو نفی کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ معنیٰ یہ ہوگا کہ کسی بشر کو یہ مناسب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُسے نبی بنائے پھر وہ لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم دے اور فرشتوں اور انبیاء کو ربّ بنا لینے کا حکم دے —— یا یہ ہو سکتا ہے لَا زائدہ نہ ہو اور معنیٰ یہ ہو کہ کسی بشر کو مناسب نہیں (خواہ نبی ہی بنا دیا جائے) کہ وہ اپنی عبادت کا حکم دے اور نہ یہ کہ وہ اپنے جیسوں کو رب سمجھ لینے کا حکم دے۔ بلکہ وہ تو ان باتوں سے منع کرتا ہے اور یہ اپنے جیسوں کو ربّ بنانا تو عبادت سے کمتر درجہ ہے (وہ تو اس کا حکم بھی نہیں دیتا پھر وہ بلند تر درجہ یعنی اپنی عبادت کا حکم کیسے دے سکتا ہے) —— باقی قرّاء نے اسے جملہ مستانفہ قرار دے کر مرفوع (وَلَا يَأْمُرُكُمْ) پڑھا ہے —— یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ حال واقع ہوا ہو (اور ذوالحال بشر ہی ہو) —— ابوعمرو نے دوری کی روایت میں اسے اختلاسِ ضمّ اور سکون سے (وَلَا يَأْمُرْكُمْ) پڑھا ہے۔

أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ کیا وہ تمہیں کفر کی بات بتلا دے گا۔

استفہام انکاری ہے —— اور اس میں ضمیر (فاعل) بشر کے لیے ہے —— یا

اللہ کے لیے ہے۔

بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خطاب مسلمانوں سے ہے اور وُہی پوچھ رہے تھے کہ آپ کو سجدہ کیا کریں ۔۔۔ { گویا اللہ تعالیٰ نے سجدہ کو جو اللہ کے سوا کسی کو کیا جائے کُفر قرار دیا اور اس سے مسلمانوں کو (ناپسند کرتے ہوئے) روک دیا۔

۱۲- حاشیہ } -

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ مَیں تمہیں کتاب اور علم دُوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصدّق ہو اُس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اُس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اُس کی طرفداری بھی کرنا۔

کہا گیا کہ یہ اپنے ظاہری معنیٰ میں ہے۔ یعنی انبیاء سے عہد لیا گیا تھا اور جب انبیاء کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا تو اُن کی اُمتیں بطریق اَولیٰ اس میں آگئیں ۔۔۔ یہ بھی کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے اور اُن کی اُمتوں سے عہد لیا تھا مگر یہاں صرف انبیاء کے عہد کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے ۔۔۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ انبیاء کی طرف جو میثاق کی اضافت ہے، یہ اضافت فاعلی ہے یعنی وہ اللہ کا عہد جو انبیاء نے اپنی اُمتوں سے لیا تھا ۔۔۔ یہ بھی کہا گیا کہ انبیاء سے مراد اولادِ انبیاء ہے یہاں لفظِ اولاد محذوف قرار دیں گے اور اولادِ انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ اُنھیں انبیاء کہا اُن کا مضحکہ اُڑانے کے لیے، کیونکہ وہ کہتے تھے کہ "ہم محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے نبوت کے زیادہ حقدار ہیں کہ

کہ ہم اہل کتاب ہیں اور انبیاء ہمیں میں سے ہوتے رہے ہیں ــــ اور (لَمَآ اٰتَیْتُکُم میں) لام قسم کی تاکید کے لیے آیا ہے کیونکہ اخذِ میثاق قسم ہی کے معنیٰ میں ہے ــــ اور (لَمَا میں) مَا شرطیہ ہو سکتا ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ جوابِ قسم اور جوابِ شرط دونوں کے قائم مقام آیا ہے ــــ اور ہو سکتا ہے مَا شرطیہ نہ ہو خبریہ ہی ہو۔ (اس صورت میں اس کی جزاء وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۱۲) ــــ حمزہ نے لِمَا (لام کی) زیر سے پڑھا ہے اس بناء پر کہ مَا مصدریہ ہے معنیٰ یہ ہوگا کہ بسبب میرے تم کو کتاب کا کچھ حصہ دینے کے پھر تمہارے پاس رسول کے آنے کے اللہ نے وعدہ لیا کہ تم اُس پر ایمان لاؤ گے اور اُس کی امداد کرو گے۔ مَا موصولہ بھی ہو سکتا ہے، معنیٰ یہ ہوگا کہ واسطے اُس چیز کے جو میں نے تمہیں دی اور تمہارے پاس آیا رسول اُس کی تصدیق کرنے والا۔ (اللہ نے عہد لیا کہ تم اُس پر ایمان لاؤ گے اور اُس کی امداد کرو گے) ــــ اور اسے لَمَّا بمعنی حِیْنَ (جب) بھی پڑھا گیا ہے یعنی جب میں تمہیں دُوں گا ــــ یا اُس چیز کی وجہ سے جو میں تمہیں دوں گا اس بناء پر کہ یہ اصل میں "لَمِنْ مَّا" تھا پھر ادغام کیا تو لَمِمَّا ہوا پھر بوجہ ثقل ایک میم کو حذف کر دیا اور لَمَّا بن گیا (اس صورت میں بھی لام موطئہ للقسم (تاکیدِ قسم) اور مِنْ سببیہ یا زائدہ ہوگا۔ ۱۲ حاشیہ) ــــ اور نافع نے ہر جگہ اٰتَیْنٰکُمْ (یعنی جمع متکلم کے صیغہ سے) پڑھا ہے۔

قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ

فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔

'اِصْر' کا معنی ہے عہد۔ اسے اِصْر اس لیے کہا گیا لِاَنَّهٗ یُؤْصَرُ کہ وہ باندھا اور پختہ کیا جاتا ہے اور اسے ضمہ سے (اُصْرِی) بھی پڑھا گیا ہے اور یہ ایک بولی ہے جیسے عُبْر عین کے ضمہ و کسرہ سے پڑھا جاتا ہے (بہت

سفر طے کرنے والی اونٹنی) ـــ یا پھر وہ اِصَار (خیمہ کے ستون سے باندھی جانے والی چھوٹی رسی) کی جمع ہے جس سے باندھا جاتا ہے۔ (اسم آلہ کا وزن فِعَال بھی ہے ۱۲)

قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد فرمایا تو گواہ رہنا۔

یعنی ایک دوسرے کے اقرار کی شہادت دو (قَالَ کا فاعل اللّٰہ ہے ۱۲) اور یہ بھی کہا گیا کہ اس میں خطاب ملٰئکۃ کو ہے (کہ تم گواہی دے دو)۔

وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

یعنی میں بھی تمہارے اقرار اور ایک دوسرے پر گواہی دینے پر شاہد ہوں اور یہ مشہو د علیہ بات میں زور پیدا کرنے کی خاطر فرمایا اور اس سے نافرمانی سے بچنے کے لیے سختی سے ڈرایا گیا ہے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ سو جو شخص روگردانی کرے گا بعد اس کے۔

(بَعْدَ ذٰلِكَ کا) معنٰی یہ ہے کہ اِس عہد اور اقرار کی پختگی اور گواہی دے دینے کے بعد۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ تو ایسے ہی لوگ بے حکمی کرنے والے ہیں۔ اور دھتکارے ہوئے یعنی کافر۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ کیا پھر دینِ خداوندی کے سوا اور کسی طریقہ کو چاہتے ہیں۔

پچھلے جملہ (اولئك هم الفاسقون) پر عطف ہے اور ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے یا محذوف کا استفہام ہے جیسے اَیَتَوَلَّوْنَ فَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یبغون (کیا وہ پیٹھ پھیر جاتے ہیں اور اللہ کے دین کے سوا کوئی اور

دین تلاش کرتے ہیں) اور مفعول (غَیْرَ دِینِ اللہ) کو مقدم کر دیا کہ اسی سے انکار مقصود ہے اس میں زور پیدا کیا گیا ہے ــــ ابی عمرو اور عاصم نے بروایت حفص اور یعقوب نے فعل یَبْغُونَ (بصیغۂ غائب) پڑھا ہے۔ اور باقی قُرّاء نے تبغُون (بصیغہ مخاطب) پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کے شروع میں قُل لھم (اُن سے کہہ دے) مقدر ماننا پڑے گا۔

وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا

حالانکہ حق تعالیٰ کے سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور بے اختیاری سے۔

یعنی مان گئے ہیں دلائل میں نظر رکھنے اور حجت کی پیروی کرنے کے ساتھ ــــ اور تلوار کے ساتھ مجبور کیے جانے اور اُس چیز کے آنکھوں دیکھ لینے کے ساتھ جو اسلام کی طرف مجبور کرتی ہے جیسے (بنی اسرائیل پر) پہاڑ کا اُٹھایا جانا اور (فرعون وغیرہ کو دریا میں) غرق کر دینا اور موت کو (اُن کا) آنکھوں کے سامنے دیکھنا ــــ یا فرشتوں اور اہلِ ایمان لوگوں کی طرح اپنی خوشی سے کرنے والے ہیں اور کافروں کی طرح مجبور و مسخّر کیونکہ وہ اُس بات سے بچنے کی (توفیق و قدرت ہی نہیں پاتے جو اُن کے لیے فیصلہ کر دی گئی۔

وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (کفار) اور سب خُدا ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

قاری حفص نے اسے یاء سے (یُرْجَعُوْن) پڑھا ہے بناء براِیں کہ ضمیر غائب "مَنْ" (موصولہ) کی طرف راجع ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ

آپ فرما دیجیے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اُس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اُس پر جو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰ و عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا اُن کے پروردگار کی طرف سے۔

آنحضور علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ آپ اپنی طرف سے اور اپنے پیروکاروں کی طرف سے ایمان کا اعلان کر دیں اور قرآن مجید جیسے آپ پر نازل شدہ ہے اسی طرح آپ کی تبلیغ کی وساطت سے اُن پر بھی نازل شدہ ہے اور اسی طرح یوں بھی ہوتا ہے کہ تمام میں سے ایک کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وہ تمام کی طرف منسوب سمجھا جاتا ہے ـــــ یا یہ کہ آپ بادشاہوں کے سے طریقے پر جلالت شان سے فرما رہے ہیں (کہ ہم پر نازل ہوا ہے) اور نزول "إلى" سے بھی متعدی کیا جاتا ہے کیونکہ اُس کا منتہا رسول ہوتا ہے اور "علیٰ" کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے کیونکہ وہ اوپر سے نازل ہوتا ہے ـــ اور اپنے پر نازل شدہ (یعنی قرآن کریم) کو تمام انبیاء پر نازل شدہ (کتب و صحائف) پر مقدم رکھا کیونکہ وہ آپ کے لیے زیادہ جانا پہچانا ہے اور یہی باقی کتب آسمانی کا معیار ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اس کیفیت سے کہ ہم اُن میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔

یعنی یہ کہ کسی کی تصدیق کریں اور کسی کو جھٹلائیں ـــ (ہم ایسا نہیں کرتے)

وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں۔

یعنی ہم فرمانبردار ہیں اور اُسی کی عبادت میں صرف اُسی کو مانتے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا۔

"غیر الاسلام" کا معنی ہے توحید اور اُس کی فرمانبرداری چھوڑ کر کوئی اور بات۔

فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ

تو وہ اُس سے مقبول نہ ہوگا اور آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام سے منہ پھیرنے والا اور اُسے چھوڑ کر کسی اور (دین) کا چاہنے والا نفع کھونے والا ہے اور گھاٹے میں پڑنے والا ہے اس لیے کہ اس طرح وہ اُس فطرتِ سلیمہ کو ضائع کر دیتا ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ــــ اور اس آیت سے دلیل دی گئی کہ اسلام ہی ایمان ہے کہ اگر ایمان اس کے علاوہ کچھ اور ہوگا تو قبول نہیں ــــ جواب یہ ہے کہ یہاں ہر غیریت رکھنے والے دین کے قبول کی نفی ہے نہ کہ ہر اُس چیز کی بھی جو اُس کے مغایر ہو ــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ 'دین' کا لفظ اعمال کے لیے استعمال ہوا ہے (یہ دوسرا جواب ہے) یعنی جو شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور 'عمل' چاہے وہ ہرگز قبول نہ ہوگا اور ایمان عمل کو نہیں کہتے (جبکہ اسلام عمل کا نام ہے)۔

کَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہوگئے بعد اپنے ایمان لانے کے اور بعد اپنے اس اقرار کے کہ رسول سچے ہیں اور بعد اس کے کہ انھیں واضح دلائل پہنچ چکے تھے۔

بعید بتانے کے لیے 'کَیْفَ' استعمال ہوا ہے (کہ یہ تو بہت بعید ہے) کہ اللہ تعالیٰ اُسے ہدایت دے کیونکہ حق سے دُوری اختیار کرنے والا بعد اس کے کہ حق اُس پر واضح ہوگیا گمراہی میں گھُسا چلا جاتا ہے اور ہدایت سے دُور ہو جاتا

ہے ـــــ یہ بھی کہا گیا کہ استفہام (کَیْفَ) سے نفی کرنا اور ناپسند کرنا مقصود ہے اور یہ بات اس کی مقتضی ہے کہ مرتد کی توبہ قبول نہیں ہوگی ـــــ اور شَہِدُوْا کا عطف ایمانہم میں پائے جانے والے معنیٰ فعل پر ہے (کفروا پر نہیں) {گویا تقدیر عبارت یوں تھی: بَعْدَ اَنْ اٰمَنُوْا وَ شَہِدُوْا (کہ بعد اس کے ایمان لائے تھے اور گواہی بھی دی تھی)} اور اس کی نظیر اللہ کا یہ قول ہے: فَأَصَّدَّقَ وَ اَکُنْ ـــــ یعنی اکن کا عطف فاصدق پر ہے (حالانکہ یہ مجزوم ہے اور وہ منصوب تو وجہ یہ ہے کہ یہاں فاء داخل ہوئی ہے اگر وہ نہ ہوتی تو وہ بھی مجزوم ہی تھا عبارت یوں ہوتی: لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ اَصَّدَّقْ وَ اَکُنْ ـ ۱۲ حاشیہ) ـــــ یا یہ کفروا سے حال واقع ہوا ہے جبکہ اس سے پہلے "قَدْ" مقدر مانا جائے ـــــ اور دونوں طور پر جو دو توجیہیں ذکر ہوئیں (یعنی ایمانہم کے معنی فعل پر عطف اور کفروا کا حال قد کے مضمر ہونے سے) یہ آیت دلیل ہے کہ زبان سے اقرار کرنا (عمل یا اسلام) حقیقت ایمان کے سوا کوئی اور چیز ہے (کیونکہ اگر اقرار یعنی شہادت داخلِ ایمان ہوتی تو ایمان کے بعد اُس کا ذکر کرنا بے مقصد تھا) (تو مطلب یہ ہوا کہ اقرار باللسان اور ظاہری اعمال جسے اسلام کہا جا سکتا ہے کے ساتھ ساتھ تصدیق قلبی یعنی ایمان بھی لازم ہے)

وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتے۔

یعنی اُن لوگوں نے نظریاتی اعتبار سے بھی کوتاہی کی اور کفر کو ایمان کی جگہ اپنایا تو پھر جس کے پاس حق آجائے اور وہ اسے پہچان بھی لے پھر اُس سے منہ پھیر لے (یہی لوگ تو ظالم و نا انصاف ہیں)۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور آدمیوں کی بھی سب کی۔

الفاظ سے دلیل ملتی ہے کہ ان لوگوں پر لعنت جائز ہے۔ اور مفہوم سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ ان کے سوا اوروں پر لعنت درست نہیں اور ممکن ہے فرق یہ ہو کہ اُن (مُرتدین) کی طبائع بھی کفر پر ہی بنی ہیں {(یہ مفسّر کا مبالغہ ہے کیونکہ ہر طبع فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوئی ہے) (اُن کے دلوں پر کُفر کی مُہر لگ چکی ہے)} وہ ہدایت سے روک دیئے گئے ہیں اور رحمت سے سراسر ناامید ہیں بخلاف اور لوگوں کے کہ وہ ابھی تک اس درجہ تک نہیں پہنچے۔) اور یہاں "وَالنَّاسِ" سے مراد مؤمنین ہیں ___ یا عامۃ الناس مُراد ہیں کیونکہ کافر بھی تو حق کے انکار کرنے والے اور اُس سے پھر جانے والے پر لعنت کرتا ہے لیکن بذاتِ خود حق کو نہیں پہچان پاتا۔

خَالِدِينَ فِيهَا وہ ہمیشہ ہمیشہ اُس میں رہیں گے۔

(فیہا" کا معنیٰ ہے) اِسی[1] لعنت میں ___ یا[2] سزا میں ___ یا[3] دوزخ میں ___ اگرچہ مؤخّر الذکر دو چیزوں کا ذکر (الفاظ میں) نہیں آیا مگر (طرزِ) کلام سے یہ بات مل جاتی ہے۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ اُن پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پائے گا اور نہ ہی اُن کو مُہلت دی جائے گی ہاں مگر جو لوگ توبہ کرلیں اس کے بعد۔

یعنی مرتد ہونے کے بعد توبہ کرلیں۔

وَأَصْلَحُوا اور اپنے کو سنوار لیں۔

جو کچھ اُنہوں نے کوتاہی و نقصان کیا تھا اُس کی تلافی کرلیں (کیونکہ صرف ندامت

اور آئندہ نہ کرنے کا عزم ہی کافی نہیں اس کے ساتھ جو حقوق وہ ادا نہ کر سکے تھے بسبب ارتداد کے اب اُسے بھی پورا کرنے کی کوشش کریں) ـــــ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا مفعول نہ مانیں بلکہ اصلحوا کا معنی دَخلوا فِی الصلاح (وہ بھلائی میں داخل ہو گئے) کر لیں۔

فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ سو بے شک خدا تعالیٰ بخش دینے والے ہیں۔

وہ اُن کی توبہ قبول کرتے ہیں۔

رَّحِيْمٌ رحمت کرنے والے ہیں۔

اُن پر مہربانیاں کرتے ہیں ـ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حارث بن سُوَید کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ اپنے مرتد ہو جانے پر پشیمان ہوا اُس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ (آنحضور علیہ السلام سے) پوچھیں کہ کیا میری توبہ منظور ہو سکتی ہے تو آنحضور علیہ السلام نے اُس کے بھائی جلاس کو یہ آیت دے کر بھیجا، چنانچہ وہ مدینہ لوٹ آیا اور تائب ہو گیا۔

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں۔

جیسے یہود کہ اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ پر ایمان لانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو نہیں مانا تھا۔ پھر آنحضور علیہ السلام اور قرآن پاک کو نہ ماننے پر اُن کے کفر میں اضافہ ہو گیا ـــــ یا[۲] یہ کہ آپ پر بعثت سے پہلے ایمان لا چکے تھے مگر آپ کے تشریف لانے پر انکار کر دیا پھر اصرار اور دشمنی اور طعن و تشنیع کر کے اور ایمان سے لوگوں کو روک کر اور نقضِ میثاق کر کے اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ـــــ یا[۳] اُن لوگوں کی طرح جو مرتد ہو گئے تھے اور اہلِ مکہ کے ساتھ مل گئے تھے پھر یہ کہنے سے اپنے کفر میں بڑھ گئے تھے کہ ہم تو محمد (صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم) کے ساتھ حوادثِ روزگار اور انقلاباتِ زمانہ کے واقع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں ـــــ یا[۲] یہ کہا تھا کہ ہم آنحضور علیہ السلام کی طرف لوٹ جائیں گے اور ایمان کا اظہار کر کے اُس سے منافقت کریں گے۔

لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ اُن کی توبہ ہرگز مقبول نہ ہوگی۔

توبہ کے قبول نہ ہونے کا مطلب ہے کہ[۱] وہ توبہ ہی نہ کریں گے ـــــ یا[۲] یہ کہ توبہ ایسی گھڑی میں کریں گے جو قبولیت کا وقت نہ ہوگا یعنی اُس وقت توبہ کریں گے جب وہ موت کے قریب ہوں گے تو یہاں عدمِ توبہ سے عدمِ قبولِ توبہ کا کنایہ کیا گیا اُن کی حالت کو سخت بتلاتے ہوئے اور اُن کے حال کو واضح کرتے ہوئے کہ وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہیں ـــــ یا[۳] اس لیے کہ اُن کی توبہ منافقت پر ہی مبنی ہوگی (لہٰذا قبولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور اس صورت میں ارتداد اور زیادۃِ کفر کا بیان بھی (عدمِ قبول کے لیے) ضروری نہ رہا اور یہی وجہ ہے کہ اس پر 'فاء' سببیّہ داخل نہیں ہوئی۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ اور ایسے لوگ پکّے گمراہ ہیں۔

وہ گمراہی پر پختہ ہو چکے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالتِ کفر ہی میں سو اُن میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی نہ لیا جاوے گا۔

اُن کا کفر پر مرنا فدیہ قبول نہ کیے جانے کا سبب ہے لہٰذا یہاں اس طرف اشارہ کرنے کے لیے "فاء (سببیّہ)" داخل کر دی گئی۔ اور مِلْءُ الشَّیْءِ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو (پورا پورا) بھر دینا اور ـــــ ذَهَبًا تمیز ہو کر منصوب

ہے ــ اور اسے مِسلاً سے بدل قرار دے کر مرفوع (ذَهَبٌ) بھی پڑھا گیا ہے ــ یا اس بناء پر کہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔

وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهٖ اگرچہ وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے۔
معنیٰ پر محمول ہے گویا یوں کہا گیا کہ اُن میں سے کسی سے فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ زمین بھر سونا ہی دے (مطلب یہ ہے کہ فدیہ قطعاً قبول ہی نہ کیا جائے گا۔۱۲) یا یہ معطوف ہے محذوف پر کہ لَوْ تَقَرَّبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَافْتَدٰى بِهٖ فِي الْآخِرَةِ {(اگرچہ وہ دنیا میں اتنا سارا سونا اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالے اور آخرۃ میں اس کے ثواب و جزاء کو بطور فدیہ پیش کرے) یعنی یہاں فدیہ کا معنیٰ ہے صدقۂ دنیوی)} ــ یا مراد یہ ہے کہ اُس کی مثل فدیہ دے گویا یہاں "بِـ...ـهٖ" میں مثل کا لفظ محذوف ہے اور باء مَعَ کے معنیٰ میں ہے معنیٰ یوں ہوگا کہ اگر وہ زمین بھر سونا دے ساتھ ہی اُس کی مانند اور دے تو بھی قبول نہ ہوگا جیسے فرمایا: وَلَوْ اَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ ــ (یہاں مِثْلَهٗ مَعَهٗ سے استشہاد کرنا مقصود ہے) اور مثل حذف کیا جاتا ہے اور کثیراً بڑھا دیا جاتا ہے کیونکہ دو ایک طرح کی اشیاء ایک ہی چیز کے حکم میں ہوتی ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اُن لوگوں کو سزا بڑی دردناک ہوگی۔
اُنہیں ڈرانے اور احتیاط اختیار کرنے میں زور دیا گیا ہے اور مایوس کر دینا مقصود ہے کیونکہ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ جو فدیہ قبول نہ کرے وہ احسان کرتے ہوئے بخش دے (تو بتا دیا کہ نہیں اُن کو سزا ہی ملے گی)۔

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ اور اُن کے کوئی حامی بھی نہ ہوں گے۔
یعنی (اُن سے) عذاب دُور کرنے میں (کوئی مددگار نہ ہوگا) اور یہاں مِنْ

مزیدہ برائے استغراق ہے (یعنی کوئی بھی ناصر نہ ہوگا)۔ ع ۹/۱۱/۱۷

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ تم خیرِ کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے۔

یعنی تم نیکی کی حقیقت کو نہیں پاسکتے جو کمالِ خیر ہے ۔۔۔ یا یہ کہ تم اللہ سے نیکی نہیں پاسکتے جو کہ اُس کی رحمت، اُس کی رضا و خوشنودی اور جنّت ہے۔

حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ یہانتک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کروگے۔

خواہ وہ مال ہو یا وہ جس کی زیادہ پروا کی جاتی ہے جیسے لوگوں کی امداد میں اپنے وقار اور جاہ کا خرچ کرنا اور بدن کا اللہ کی فرمانبرداری میں خرچ کرنا اور جان کو اُس کی راہ میں خرچ کرنا ۔۔۔ روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے مالوں میں مجھے بیرحا کی جاگیر (باغ) سب سے زیادہ پسند ہے، آپ اسے اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا: خُوب خُوب! یہ مال بڑا عمدہ ہے۔ (یا یہ کہ بڑا نفع بخش ہے) اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اسے اپنے رشتہ داروں میں خرچ کر دے ۔۔۔ اور زید بن حارثہ ایک گھوڑا لے آئے جو اُنہیں محبوب تھا عرض کیا یہ اللہ کی راہ میں حاضر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُس پر اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سوار کر دیا۔ اس پر زید نے عرض کیا: حضور! میں نے تو اسے صدقہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: بلا شبہ اللہ نے اسے تجھ سے قبول کر لیا ۔۔۔ اور اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ پسندیدہ ترین اَموال اپنے قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرنا زیادہ درجہ رکھتے ہیں ۔۔۔ اور آیت عام ہے صدقاتِ واجبہ کو بھی اور صدقاتِ نافلہ کو بھی ۔۔۔ اور اسے بَعْضَ مَا تُحِبُّوْنَ بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مِنْ تبعیض کا ہے (یعنی پسندیدہ ترین مال میں سے کچھ خرچ کر دینا کافی ہے ضروری نہیں کہ سارا

ہی خرچ کیا جائے) اور ہو سکتا ہے مِنْ (تبعیض کا نہ ہو بلکہ) بیانیہ ہو۔ (یعنی خرچ کرو اپنی پسندیدہ چیزیں ـــــ)

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے۔

یعنی پسندیدہ چیزوں میں سے کوئی سی یا اُس کے علاوہ اشیاء میں سے یہاں 'مِنْ' 'مَا' (موصولہ) کا بیان ہے۔

فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ اللہ تعالیٰ اُس کو بھی خوب جانتے ہیں۔

لہٰذا اُس کے مطابق تمہیں جزاء دے گا۔

کُلُّ الطَّعَامِ سب کھانے کی چیزیں۔

اور اس سے مُراد اُن کا کھانا ہے۔

کَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بنی اسرائیل پر حلال تھیں۔

یعنی اُن کے لیے اُن کا کھانا حلال تھا اور حِلًّا مصدر ہے جو بطور نعت (کلمۂ صفت) آئی ہے یہی وجہ ہے کہ واحد، جمع اور مذکر و مؤنث سب اس میں برابر ہیں جیسے فرمایا: لَاھُنَّ حِلٌّ لَّھُمْ (یعنی جمع مؤنث کے لیے بھی حِلٌّ کا لفظ ہی آیا۔)

اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ باستثناء اُس کے جس کو یعقوب نے حرام کر لیا تھا۔

عَلٰی نَفْسِہٖ اپنے نفس پر۔

حرام کردہ چیزیں جیسے اونٹ کا گوشت اور اُس کا دودھ ـــــ یہ بھی کہا گیا کہ آپ کو 'عرق النساء' کا مرض تھا اور آپ نے نذر مانی کہ اگر آپ شفایاب ہو جائیں تو اپنا پسندیدہ کھانا چھوڑ دیں گے اور یہی (اونٹ کا گوشت وغیرہ) آپ کا پسندیدہ کھانا تھا ـــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ آپ نے اطباء کے کہنے پر

بطور دواء (یعنی پرہیز کی خاطر) ایسا کیا تھا ـــــ اور اُس شخص نے جو کہتا ہے کہ نبی اجتہاد کر سکتا ہے یہاں سے دلیل پکڑی ہے اور جو شخص اجتہادِ نبی کا قائل نہیں وہ کہتا ہے کہ یہ تو اللہ کے حکم سے تھا گویا وہ پہلے ہی حرام تھا (لہذا اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ نزولِ توراۃ سے قبل۔

اُن کے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے اُن کی سزا اور اُن پر سختی کی خاطر کچھ چیزوں کے حرام ہونے کے احکام تھے ـــــ اور یہ تردید ہے یہود کے اس دعویٰ کی کہ وہ بری ہیں اُس الزام سے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے یُوں دی ہے: وَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ (یہودی لوگوں کے ظلم و زیادتی کی وجہ سے ہم نے اُن پر پاکیزہ چیزیں بھی حرام کر دیں) اور دوسری جگہ فرمایا: وعلى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ (ہم نے یہودیوں پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا) ـــــ یہودی کہتے تھے کہ یہ ہم پر ہی حرام نہیں کی گئیں بلکہ (ہم سے) پہلے حضرت نوح، حضرت ابراہیم علیہما السلام اور اُن کے بعد بھی حرام ہی تھیں حتیٰ کہ معاملہ ہم تک پہنچا ـــ لہذا پہلوں کی طرح ہم پر بھی حرام ہی رہیں ـــــ اور اس میں جواب ہے کہ نسخ منع نہیں ہوئی (یعنی قرآن توراۃ و انجیل کا ناسخ ہے۔) اور آنحضور علیہ السلام پر طعن کا جواب ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہم بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرح اونٹوں کا گوشت اور دودھ حلال قرار دیتے ہیں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

فرما دیجیے کہ پھر توراۃ لاؤ پھر اُسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔

اُن کے ساتھ دلائل بازی کرنے میں اُنہی کی کتاب لانے کا حکم فرمایا اور توراۃ میں موجودہ احکام سے ہی اُنہیں لاجواب کرنا مقصود ہے کیونکہ اُن پر اُن کے ظلم و تعدی

کی وجہ سے وہ چیزیں حرام کر دی گئیں جو پہلے حرام نہ تھیں ـــــ روایت ہے کہ آنحضور علیہ السلام نے جب اُن سے یہ فرمایا تو وہ مبہوت و ششدر رہ گئے اور تورات لانے کی جسارت نہ کر سکے۔ اور اس میں آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے۔

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ سو جو شخص اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کی تہمت لگائے۔

یعنی اپنے زعم میں اللہ تعالیٰ پر بات بنائے کہ یہ (حرام شدہ چیزیں) تو تورات کے نازل ہونے سے پہلے بھی بنی اسرائیل پر حرام تھیں بلکہ اس سے بھی پہلے کے لوگوں پر حرام کی گئی تھیں۔

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ اس کے بعد۔

یعنی بعد اس کے کہ اُن پر حجت و دلیل قائم کر دی گئی۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ تو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں۔

(ایسے ظالم) جو اپنی جانوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے اور حق کا مقابلہ کرتے ہیں حالانکہ وہ اُن پر واضح ہو چکا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا۔

یہ اُن کے جھوٹ پر تعریض کرنا مقصود ہے۔ یعنی ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ تو سچا ہے اُس بات میں جو اُس نے نازل کی جھوٹے تم ہی ہو۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا سو تم ملتِ ابراہیم کا اتباع کرو جس میں ذرا کجی نہیں۔

یعنی ملتِ اسلام جو اصل میں ملتِ ابراہیمی ہے ـــــ یا یہ مراد ہے کہ تم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے مشابہ ملت کی پیروی کرو تاکہ تم یہودیت سے چھٹکارا

پاسکو جس نے تمہیں دُنیوی اغراض کے پورا کرنے کی خاطر تحریف اور غرور (ومقابلہ) پر مجبور کیا ہے اور جو تم پر پاکیزہ چیزوں کے حرام ہونے کا باعث ہوئی (وہ پاکیزہ چیزیں) جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے تابعین کے لیے حلال رکھا۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور وہ مُشرک نہ تھے۔

اس میں اشارہ ہے کہ اُن کا اتباع ضروری ہے توحیدِ خالص میں (جو شرک سے پاک ہو) اور استقامت فی الدّین میں اور اِفراط اور تفریط سے بچ جانے میں ـــــ اور اس میں یہود کے شرک کے بارے میں تعریض ہے (یعنی یہ کہ حضرت ابراہیم تو مشرک نہیں تھے تم مشرک ہو)

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا۔

یعنی عبادت کی خاطر بنایا گیا اور لوگوں کے لیے عبادت گاہ بنایا گیا ـــــ بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس پر اس سے دلیل ملتی ہے کہ (اسمِ فاعل کے وزن پر یعنی) فعلِ معروف وَضَعَ بھی پڑھا گیا ہے۔

لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ وہ مکان ہے جو کہ مکّہ میں ہے۔

بَکّہ مکہ کی دوسری بولی ہے جیسے نبیط اور نمیط (ایک پست درجہ کی قوم) دونوں لفظ ایک ہی معنیٰ کے لیے بولے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح اَمرٌ راتبٌ کی بجائے امرٌ راتمٌ (طے شدہ یا مقرر کردہ معاملہ) اور لازب اور لازم وغیرہ ـــــ اور یہ بھی) کہا گیا کہ بکّۃ مسجد کی جگہ کو کہتے ہیں اور مکّہ شہر کا نام ہے ـــــ بکّۃ بکٌّ سے لیا گیا جس کا معنیٰ ہے رکاوٹ پیدا کرنا یا کوٹ دینا (اور تباہ کر دینا) کیونکہ یہ (مقامِ عالیشان) بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں توڑ

دیتا ہے ـــــ روایت ہے کہ حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بطور عبادت گاہ بنایا گیا کون سا ہے ؟ آپ نے فرمایا "مسجد حرام" پوچھا گیا: "اس کے بعد؟" فرمایا: "بیت المقدس (تعمیر کیا گیا)"۔ پوچھا گیا: "ان دونوں کے درمیان کتنی مدّت کا فرق ہے؟" فرمایا: "چالیس سال" ـــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ جس نے اسے پہلے بنایا وہ حضرت ابراہیم تھے پھر یہ گھر گر گیا تو اسے بنی جُرہُم میں سے کچھ لوگوں نے بنایا پھر عمالقہ (عملیق: قدآور لوگ) نے پھر قریش نے تعمیر کیا ـــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ پہلا گھر ہے جسے سیّدنا آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا پھر یہ طوفانِ نوح میں مٹ گیا اور بعد میں ابراہیم علیہ السلام نے اسے نئے سرے سے بنایا ـــــ یہ بھی کہا گیا کہ آدم علیہ السلام سے پہلے یہاں ایک گھر تھا جس کا نام 'الضراح' (بیت المعمور) تھا اور فرشتے اُس کا طواف کیا کرتے تھے۔ پھر جب آدم علیہ السلام جنّت سے دُنیا میں ڈالے گئے آپ کو حکم دیا گیا کہ اُس کی زیارت کیا کریں اور اس کے گرد طواف کیا کریں اور طوفانِ نوح کے موقع پر اُسے چوتھے آسمان پر اُٹھا لیا گیا جس کا طواف ملائکہ آسمانی کیا کرتے تھے ـــــ تاہم یہ روایت ظاہری الفاظ سے ثابت نہیں ہوتی ـــــ یہ بھی کہا گیا کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ یہ بلحاظِ شرف و بزرگی پہلا گھر ہے، نہ بلحاظِ زمان و وقت۔

مُبَارَكًا جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے۔

یعنی اس میں بہت بھلائی ہے اور بہت مَنافِع ہیں اُس شخص کے لیے جو اس کا حج کرے اور عمرہ کرے اور اس میں اعتکاف کرے اور اس کے گرد طواف کرے ـــــ یہ حال ہے اُس ضمیر سے جو ظرف (ببکۃ) میں چھپی ہوئی ہے یعنی شئ (بکہ والے گھر کا حال یہ ہے کہ وہ بابرکت ہے۔ ح۔)

وَهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ اور جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے۔

اس لیے کہ وہ اُن کا قبلہ ہے اور اُن کی جائے عبادت ہے اور اس لیے بھی کہ اس میں عجیب اور انوکھی نشانیاں ہیں، جیسے فرمایا:

فِيْهِ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ اس میں کھلی نشانیاں ہیں۔

پرندے بیت اللہ کے سامنے سے آکر مُڑ جاتے ہیں اور مدّتوں سے ایسا ہو رہا ہے (مگر معلوم ہوا ہے کہ یہاں یا تو مفسّر کو غلطی لگی ہے یا اس نے غلو سے کام لیا ہے کیونکہ یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے ۱۲ نعیم) —— اور یہ کہ پھاڑ کھانے والے درندے حرم میں شکار کیے جانے والے جانوروں کے ساتھ مل کر پھرتے ہیں اور انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتے اور یہ کہ جس سرکش نے بھی اس گھر کی طرف بُرائی کا قصد کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اُسے تباہ و برباد کر دیا جیسے اصحابِ فیل وغیرھم —— اور یہ جملہ تفسیر کرنے والا ہے ھُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ کی —— (یعنی یہ نشانیاں وغیرہ رہنمائی کرتی ہیں) یا یہ دوسرا حال ہے۔

مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ منجملہ اُن کے ایک مقامِ ابراہیم ہے۔

یہ مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے گویا اصل عبارت یوں تھی: 'مِنْهَا مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ'۔ یا یہ فیہ اٰیاتٌ سے بدل بعض من الکل ہے —— (کہ ایک نشانی یہ ہے) —— اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ عطفِ بیان ہے (واؤ عاطفہ کے بغیر عطف کو عطفِ بیان کہا جاتا ہے، واؤ عاطفہ موجود ہو تو عطفِ نسق ۱۲) اس بنا پر کہ آیات سے مُراد ٹھوس چٹان پر قدم مبارک کا نشان رہ جانا اور ٹخنوں تک اُس میں دھنس جانا، اور باقی چٹانوں میں سے اس ایک چٹان کا نرمی کے لیے مخصوص کرنا اور تمام انبیاء کے باقی نشانات کو چھوڑ کر آپ ہی کے نشان کو باقی رکھنا اور کثرتِ اعداء کے باوجود ہزاروں سال تک اُس کا محفوظ رکھنا وغیرہا۔

اس کی تائید اُس قراءت سے ہوتی ہے جس میں اٰیَۃٌ بَیِّنَۃٌ واحد پڑھا گیا ہے ـــــ اور اس نشان کا سبب یہ ہوا کہ جب کعبہ کی عمارت بلند ہو گئی تو آپ اس پتھر پر کھڑے ہو گئے تاکہ آپ پتھروں کے اُٹھانے (اور بیت اللہ کی تعمیر مکمل کرنے) پر قدرت پا سکیں۔ اس پر آپ کے قدم مبارک اُس چٹان میں دھنس گئے۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا اور جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے۔

یہ جملہ ابتدائیہ ہے {یعنی اس میں خبریہ (از مبتدا و خبر) (اس صورت میں مَنْ اسم موصول ہوگا)}۔ یا شرطیہ ہے (اس صورت میں مَنْ کلمہ شرط اور کَانَ اُس کی جزا ہے) اور (دونوں صورتوں میں) مَقَامُ اِبْرَاهِيْم پر معنوی طور پر معطوف ہے کیونکہ یہ اس معنی میں ہے کہ اَمْنَ مَنْ دَخَلَهٗ یعنی مِنْهَا اَمْنُ مَنْ دَخَلَهٗ (اُن نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو اس گھر میں داخل ہوا امن پا گیا ۱۲) ـــــ یا یہاں مِنْهَا مقدر نہ کریں بلکہ اصل عبارت یوں سمجھیں فِيْهِ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ وَ اَمْنُ مَنْ دَخَلَهٗ ـــ (اس میں نشانیاں ہیں واضح مقامِ ابراہیم اور اُس شخص کا امن پانا جو اس میں داخل ہو)۔ اور آیات جمع کا لفظ لا کر بہت سی نشانیاں بتانے کی بجائے صرف دو پر ہی اکتفا کیا اور باقیوں کا ذکر نہیں کیا جیسے حضور علیہ السلام نے فرمایا: حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ اَلطِّيْبُ وَالنِّسَاءُ وَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ ـــــ {تمہاری دنیا میں سے مجھے تین چیزیں پسند ہیں خوشبو اور (نیک) عورتیں ـــــ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک تو نماز میں ہے (یہاں مقامِ استشہاد یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے تین چیزوں کی بجائے (دنیا کی) دو ہی

چیزوں کا ذکر فرمایا اور تیسری کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ ایک مستغنی کر دینے والا جملہ فرمایا کہ یہ سب چیزیں (دنیا کی) تو عارضی ہیں اصل تو یادِ محبوب ہے : لہذا میری آنکھیں وہیں ٹھنڈی ہوتی ہیں میرا دل وہیں تسکین پاتا ہے جب میں یادِ محبوبِ حقیقی میں مستغرق ہو جاتا ہوں ـــــ

ے نہ دنیا میں ، نہ دولت میں ، نہ گھر آباد کرنے میں

میرا دل چین پاتا ہے خُدا کو یاد کرنے میں

یہاں ایک اشتباہ یہ ہو سکتا ہے کہ تیسری محبوب چیز بھی نماز ہے جسے حضور بیان فرمانا چاہتے تھے مگر جواب یہ ہے کہ نماز تو دنیا کی چیز نہیں' آخرت کی چیز ہے اور حضور نے فرمایا : مِنْ دُنْیَاکُمْ تمہاری دُنیا میں سے محبوب تین چیزیں ۱۲}

(اللہ تعالیٰ نے دو ہی نشانیوں "مقامِ ابراہیم" اور "اٰمِنُ مَنْ دَخَل" کے ذکر پر اکتفاء کیا) کیونکہ یہ دونوں دونوں جہانوں میں رہتی دنیا تک اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سوا دوسری چیزوں سے مستغنی کر دیتی ہیں اور قیامت کے دن عذاب سے امن حاصل ہوگا۔ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا : مَنْ مَاتَ فِی اَحَدِ الْحَرَمِیْنِ بُعِثَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اٰمِنًا ـــ (جو شخص حرمین شریفین میں سے کسی ایک میں فوت ہو جائے قیامت میں امن و سلامتی سے اُٹھے گا یعنی عذاب سے محفوظ رہے گا) ــــــ اور امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جس شخص کا قتل کرنا بوجہ مرتد ہو جانے کے یا قصاص وغیرہ میں ضروری ہو جائے اور وہ حرم میں پناہ پکڑے اُس سے تعرض نہ کیا جائے البتہ اُسے وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جائے۔ (پھر حدِ شرعی جاری کی جائے ۱۲)۔

وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ اور اللہ کے واسطے لوگوں کے

ذمہ اُس مکان کا حج کرنا ہے۔

(حج کا مطلب ہے) مخصوص طریقے پر اُس کی زیارت کا قصد کرنا۔

اختلافِ قراءت: حمزہ، کسائی اور عاصم نے بروایت حَفص اسے کسرہ سے (حِجُّ) پڑھا ہے۔ جو اہلِ نجد کی بولی ہے۔

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا یعنی اُس شخص کے ذمّہ جو طاقت رکھے وہاں تک کی سبیل کی۔

'الناس' سے بدل بعض من الکل ہے اور 'الناس' میں تخصیص پیدا کرنے کی خاطر آیا ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے 'استطاعۃ' کا مفہوم 'زاد و راحلہ' بیان فرمایا ہے اور اس سے امام شافعی علیہ الرحمۃ کے معنیٰ کی تائید ہوتی ہے کہ استطاعت کا مطلب ہے (وہاں تک جانے آنے کے لیے) مالی طاقت (رکھتا ہو) اور اسی لیے اُنھوں نے فرمایا کہ اگر خود نہ کرسکے تو اُسے ضروری ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو نائب بنا کر بھیج دے جب اُس کے پاس نائب بنانے کے لیے مالی طاقت ہو ــــــ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ استطاعت کا معنی ہے بدن کی طاقت، لہٰذا جو شخص چلنے اور راستے میں کما کھانے پر قُدرت رکھتا ہو اُس پر حج کرنا واجب ہے ــــــ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں (استطاعت بالمال اور بالبدن) دونوں آجاتی ہیں۔ لہٰذا جب دونوں پائی جائیں استطاعتِ مالی بھی اور استطاعتِ بدنی بھی تب جاکر حج واجب ہوتا ہے ــــــ اور 'اِلَيْهِ' میں ضمیر 'البیتِ' کی طرف راجع ہے ــــ یا حِجّ کی طرف ــــ اور وہ تمام اسباب جو کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ ہوں اُس کی 'سبیل (ذریعہ)' کہلاتے ہیں۔

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ اور جو شخص منکر ہو

تو اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہیں۔

جو شخص حج نہ کرے اُس کے لیے کفر کا لفظ استعمال کیا گیا تاکہ بتایا جائے کہ یہ امر کتنا زیادہ ضروری (اور واجبِ تاکیدی) ہے اور اس لیے کہ حج کے ترک کرنے والے پر سختی دکھائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا [جو شخص حج کیے بغیر مرگیا (حالانکہ استطاعت رکھتا تھا) تو وہ (کفر کی موت) مرا خواہ یہودی ہو کر یا نصرانی ہو کر]۔

اس آیت میں کئی دلائل سے حج کا واجب ہونا ثابت کیا ـــ پہلے تو جملہ اسمیہ لائے اور خبر 'لِلّٰهِ' کو مقدم رکھا (جملہ اسمیہ میں جملہ فعلیہ کی نسبت زیادہ زور اور تاکید ہوتی ہے)۔ پھر اُسے اس طرح رکھا جس سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگوں کی گردنوں میں اللہ تعالیٰ کا حقِّ واجب ہے ـــ پھر پہلے حکم کو عام رکھا اس کے بعد اسے خاص کر دیا، گویا مُبہَم (غیر واضح) بیان کر دینے کے بعد اُسے واضح (اور صاف) کر دیا۔ اور مقصود میں تاکید کی خاطر اُسے دوبارہ ذکر کیا اور دُہرایا ہے ـــ اور حج نہ کرنے کو کفر کا نام دیا کیونکہ یہ کافرانہ کام ہے ـــ اور یہاں استغناء (کہ اللہ بے پروا ہے) کا ذکر کیا کیونکہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے کافروں سے ناراض ہونے پر اور انہیں ذلیل و رسوا کرنے پر دلیل دینا مقصود ہے ـــ "اور یہ جو فرمایا 'عن العالمین'، تو اس سے حکم کے عام کرنے میں مبالغہ کی طرف اشارہ ہے (کہ اللہ کو کسی عالَم میں کسی کی پروا نہیں ـــ اور اس میں اس کے تمام عالمین کی طرف اشارہ ہے (کہ اللہ کو کسی عالم میں کسی کی پروا نہیں) ـــ اور اس میں اس کے تمام عالمین سے مستغنی ہونے پر دلائل کے ساتھ رہنمائی کی گئی ہے۔ اور (حج نہ کرنے والے پر) اللہ کی سخت ناراضی بتائی گئی کیونکہ

حج کرنا ایک ایسا فریضہ ہے جو بہت ناگوار گزر سکتا ہے ـــ اس میں کسرِ نفس، بدن کو تھکانا، مال کا خرچ کرنا، خواہشاتِ (نفسانی) سے الگ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھانا (بیک وقت) سب موجود ہیں۔

شانِ نزول: روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام اہلِ مذاہب کو بُلایا اور اُن سے خطاب کیا اور فرمایا کہ "اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ کَتَبَ علیکم الحَجَّ فَحُجُّوْا۔ (اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے لہذا تم لوگ حج کیا کرو)" اس پر ایک مِلّت ایمان لائی اور پانچ مِلّتیں نہ مانیں ـــ اس موقع پر یہ آیت وَمَنْ کَفَرَ الخ نازل ہوئی۔

قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ آپ فرما دیجیے کہ اے اہلِ کتاب تم کیوں انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کا۔

یعنی اُس کی آیاتِ سمعیہ اور عقلیہ کا جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صداقت پر دال ہیں اُس امر میں جس کی طرف وہ دعوت دیتے ہیں حج اور دیگر واجباتِ شرعیہ کے معاملہ میں (حج کا فرض ہونا آیاتِ ماسبق میں ذکر ہو چکا) یہاں اہلِ کتاب کو خاص طور پر خطاب فرمایا یہ دلیل ہے اس بات پر کہ اُن کا کفر قبیح تر ہے بحالانکہ وہ آیاتِ الٰہیہ کو اچھی طرح سے پہچانتے ہیں ـــ اور یہ آیت اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اگرچہ وہ توراۃ و انجیل پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں مگر حقیقتِ حال اس کے خلاف ہے، وہ نہ توراۃ کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں نہ انجیل کے فرامین پر۔

وَاللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں۔

تم اپنے آپ کو مومن گردانتے ہو اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام

اعمال کو دیکھتے اور اطلاع رکھتے ہیں پھر وہ تمہیں اُن کے عوض جزاء و سزا دیں گے اور اُس وقت یہ تحریف اور کتمانِ حق کام نہ آئے گا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ آپ فرما دیجیے اے اہلِ کتاب کیوں ہٹاتے ہو اللہ کی راہ سے ایسے شخص کو جو ایمان لا چکا۔

خطاب اور استفہام کو مکرر لا کر اس سے اُن کی سرزنش میں مبالغہ مقصود ہے (کہ اے اہلِ کتاب تم عالم ہونے کے باوجود ایسا کیوں کرتے ہو) اور تکرار سے یہ بھی مقصود تھا کہ خُدا کی راہ سے روکنے میں اُن کے پاس کوئی عذر نہ رہے اور یہ بھی کہ یہ دونوں کام (کفر بایاتِ اللہ اور صد عن سبیل اللہ جو تم کرتے ہو) اپنی اپنی جگہ پر قبیح ہیں (دونوں مل گئے تو بڑی قباحت ہو گی) ان دونوں میں سے ہر ایک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا عذاب کھینچ لانے میں کافی تھا (مگر تم ہو کہ بیک وقت دونوں کے مرتکب ہو رہے ہو) — اور سبیل اللہ سے مُراد اللہ تعالیٰ کا دینِ حق ہے جس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ اسلام ہے۔

کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں میں فتنہ انگیزی کرتے تھے اور اُنہیں ایک دُوسرے کے خلاف اُکساتے تھے یہاں تک کہ وہ اوس و خزرج قبیلوں کے پاس آئے (جو صدیوں کی خانہ جنگی کے بعد اسلام لا کر بھائی بھائی بن چکے تھے) ان لوگوں نے اُنہیں وہ لڑائیاں اور دشمنی یاد دلائی جو زمانہ جاہلیت میں اُن میں رہی تھی اور اُن کا مقصد اس سے یہ تھا کہ پھر ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں اور وہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنے کی حیلہ بازیاں کرتے تھے۔

تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اس طور پر کہ کجی ڈھونڈتے ہو اس راہ کے لیے۔

یہ حال ہے ضمیر خطاب تصدّون سے یعنی تم اِس دین میں کجی کی تلاش

اور کوشش کرتے رہتے ہو۔ تم ملمع کاری کرتے رہتے ہو کہ لوگوں کو شبہ اور وہم میں ڈال دو کہ یہ دین تو حق سے دُور ہے ــــ (اس شریعت نے جو شریعت موسویہ میں) نسخ (کیا اُس) کو تم تسلیم نہیں کرتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر مبارک اور صفاتِ جلیلہ بدل دیتے ہو اور اسی طرح سے تم دینِ حق میں کجی چاہتے ہو ــ یا اس سے یہ مُراد ہے کہ تم مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اُکساتے ہو تاکہ اُن کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور اُن کے دینی معاملات میں خلل واقع ہو جائے۔

وَ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ حالانکہ تم خود بھی اطلاع رکھتے ہو۔

یعنی یہ کہ تم جانتے ہو کہ یہ خدا کی راہ ہے اور اس سے روکنا بذاتِ خود گمراہی اور دوسرے کو گمراہ کرنا ہے اور تم تو اپنے اہلِ مذہب میں عادل سمجھے جاتے ہو، لوگ تمہاری باتوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنے جھگڑوں میں تمہیں گواہ قرار دیتے ہیں۔

وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

یہ اُن کے واسطے وعید ہے ــــ اور جبکہ سابقہ آیت میں ناپسندیدہ امر اُن کا کفر تھا اور وہ اُسے ظاہر و باہر کرتے تھے لہذا وہاں فرمایا: واللہ شہید علی ما تعملون۔ اور جب کہ اس آیۃ میں اُن کا مومنین کو اسلام سے روکنے کا ذکر تھا اور اسے وہ چھپاتے تھے اور اس میں وہ حیلہ بازیاں کرتے تھے لہذا فرمایا کہ (یہ دقیق و مخفی تدبیر انسانوں سے تو چھپی رہ سکتی ہے مگر) و ما اللہ بغافل عمّا تعملون۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقہ کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ لوگ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد کافر بنا دیں گے۔

یہ آیت اوس اور خزرج کے چند آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے پاس سے شاس بن قیس یہودی گزرا تو اُسے اُن کی آپس کی اُلفت اور مل بیٹھنے نے غصے میں ڈال دیا۔ لہذا اُس نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ اُن کے پاس جا بیٹھے اور انہیں یوم بُعاث یاد دلائے اور اُنھیں اُن اشعار میں سے کچھ شعر سنائے جو اُس جنگ کے بارے میں کہے گئے تھے۔ اور اس جنگ میں قبیلہ اوس کو فتح ہوئی تھی۔ چنانچہ اُس یہودی نے ایسا ہی کیا اور وہ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے، باہمدگر فخر کرنے لگے اور ایک دوسرے کے خلاف غصے میں آگئے اور پکار اُٹھے: "ہتھیار لاؤ، ہتھیار لاؤ" اور دونوں قبیلوں میں سے بہت لوگ جمع ہو گئے۔ (یہ شور سُن کر) رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ تشریف لائے اور آپ نے فرمایا: "میرے ہوتے ہوئے تم زمانہ جاہلیت کو واپس لانا چاہتے ہو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نعمتِ اسلام سے مشرف کیا ہے، اُس کے ذریعہ جاہلیت کے تمام امور کو ختم کر دیا ہے اور تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی ہے" اس پر وہ سب سمجھ گئے کہ یہ شیطان کا وسوسہ تھا اور اُن کے دشمن کی ایک چال تھی۔ پھر اُنھوں نے ہتھیار پھینک دیئے، اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوئے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ واپس ہو گئے۔ اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بلا واسطہ خطاب فرمایا حالانکہ پہلے آنحضورؐ

کو حکم فرمایا تھا کہ وہ اہلِ کتاب کو خطاب کریں (یعنی صیغۂ امر قُلْ فرمایا تھا) تو یہ مؤمنین سے بلا واسطہ گفتگو اُن کی بزرگیٔ مرتبت کو ظاہر کرتی ہے اور یہ کہ اصل حقدار یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں خطاب کرے اور اُن سے گفتگو کرے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ اور تم کفر کیسے کر سکتے ہو؟ حالانکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں

استفہام انکاری ہے اور تعجب ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمہارے اندر اسباب و دواعی تو ایمان کے ہیں جو کفر سے دُور ہٹانے والے ہیں پھر تمہارا کفر کیسے تصور میں آسکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے۔

یعنی اُس کے دین پر استقامت سے عمل پیرا رہتا ہے یا جو تمام اُمور میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تو ضرور راہِ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔

یعنی وہ لامحالہ ہدایت پا جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو (جیسا) ڈرنے کا حق ہے۔

یعنی حقِ تقویٰ ادا کرو اور جو چیزیں اس تقویٰ کی وجہ سے ضروری ہیں اُن پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اور وہ واجب امور کا حتی الوسع پورا کرنا اور منع کردہ امور سے حتی المقدور بچ جانا یعنی شرعی احتیاط کی زندگی اختیار کرنا ہے جیسے

فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ۲ اور سیدنا ابن مسعود نے تقویٰ کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا دم بھر لیا جائے تو پھر اُس کی نافرمانی کبھی نہ کی جائے اور اُس کا شکر ادا کیا جائے تو پھر کبھی کفرانِ نعمت نہ کیا جائے اور اسے یاد کیا جائے تو پھر اُسے بھلا نہ دیا جائے ــــ تقویٰ کی تیسری ۳ تعریف یوں کی گئی ہے کہ اطاعت کو التفات سے پاک کر لیا جائے (یعنی اُسے غرضِ منصبی سمجھے نہ کہ جائے کبر و غرور) اور اُسے اجر و ثواب کی توقع سے بھی پاک کر لے (اُس آقائے حقیقی نے اجر کا وعدہ تو فرمایا ہے مگر طاعت کا اجر اُس پر واجب نہ سمجھے، اللہ پر کچھ واجب نہیں، ہم پر سب کچھ واجب ہے) اور اس میں اہلِ کتاب کی طاعت سے بچنے کی تاکید ہے اور ــــ تقاۃ کا اصل وُقْیَۃ ہے۔ واؤ مضمومہ کو تا سے بدل دیا گیا جیسے تُؤَدَۃ تُخَمَہ اصل میں وُؤَدَۃ وُخَمَۃ تھا ــــ پھر تُقْیَۃ (اصل وُقْیَہ) کی یا مفتوح کو الف سے بدل دیا۔ اس طرح تُقَاۃً بن گیا۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

یعنی جب تمہیں موت آئے تو تم نہ ہونا کسی حال پر سوائے حالِ اسلام کے (یعنی موت کا کوئی وقت معلوم نہیں زندگی مختلف احوال سے عبارت ہے لہذا ہر حال میں مسلمان رہنا چاہیے اور ہر وقت تیار رہنا چاہیے کہ جب بھی موت آئے تم مسلمان ہو۔) (حال اور صفت کو نحو میں قید کہتے ہیں مثلاً جاءنی رجلٌ عالمٌ میں عالمٌ قید ہے اور رجلٌ مقید ہے۔) اور نہی عن المقید حال وغیرہ کی صورت میں کبھی کبھی نفسِ فعل سے ہوتی ہے (اور قید پر نہیں ہوتی) اور کبھی صرف (امر زائد یعنی) قید پر ہوتی ہے (فعل کا اعتبار نہیں ہوتا) اور

کبھی دونوں سے نہی ہوتی ہے۔ اور اسی طرح نفی کا حال ہے (لا تموتن إلّا الخ میں نہی اُس قید سے ہے جو بعد میں مذکور ہوئی یعنی...... مُسْلِمُونَ)۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلے کو۔

یعنی دینِ اسلام یا اللہ تعالیٰ کی کتاب۔ کیونکہ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسّی ہے۔ یہاں دینِ اسلام یا کتاب اللہ کو اللہ کی رسّی سے تشبیہ دی گئی۔ اس لیے کہ اُسے مضبوطی سے تھام لینا اُس کی تعلیمات پر عمل کرنا اسی طرح سلامتی کا سبب ہے جس طرح رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے سے انسان گرنے سے بچ جاتا ہے (کیونکہ نجات دلانے میں دونوں فعل مشترک تھے لہٰذا رسّی سے تشبیہ دے دی۔) اور پھر مضبوطی سے پکڑنے اور اُس پر انحصار کرنے کے لیے اعتصام کا لفظ استعمال فرمایا (جو مناسب تھا حبل کے جو مشبہ بہ ہے) یہ استعارہ ترشیحیہ للمجاز ہے (ترشیح: تزئین۔ ایک چیز کو دوسری سے تشبیہ دینا اور پھر اُس کی مناسبات بیان کرنا استعارہ ترشیحیہ کہلاتا ہے)۔

جَمِيعًا اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو۔
سب کے سب اکٹھے ہو کر حق کی تعلیمات پر عمل کرو۔

وَلَا تَفَرَّقُوا اور باہم نااتفاقی مت کرو۔

ایک تاء برائے تخفیف حذف کر دی ---- ۱ آپس میں اختلاف کر کے اہلِ کتاب کی طرح حق سے جُدا نہ ہو جاؤ۔ یا ۲ یہ کہ آپس میں نہ بٹ جاؤ جس طرح تم عہدِ جاہلیۃ میں بٹ گئے تھے ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگے تھے۔ یا ۳ یہ کہ ایسی باتوں کا ذکر بھی نہ کرو جو موجب تفرق یا الفت زائل کرنے کا سبب بنیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اُسے یاد کرو۔

منجملہ اُس کے ہدایت اور توفیقِ اسلام ہے جو باہمی اُلفت پیدا کرتی اور کینہ زائل کرتی ہے۔

اِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً جب کہ تم دشمن تھے۔

جاہلیت میں تم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے۔

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں اُلفت ڈال دی۔

بسبب اسلام کے۔

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا سو تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

ایک دوسرے سے محبت اور اللہ کے لیے آپس میں بھائی چارہ رکھنے والے بن گئے۔ اور کہا گیا ہے کہ اوس اور خزرج باپ کی طرف سے آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔ پھر اُن میں عداوت پیدا ہو گئی اور تقریباً ایک سو بیس ۱۲۰ سال تک اُن کی آپس میں جنگ رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کی آگ کو اسلام کی بدولت بجھا دیا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی برکت سے اُن میں اُلفت پیدا فرما دی۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔

یعنی اپنے کفر کی وجہ سے تم جہنم کی آگ میں گرنے کے قریب تھے اگر تمہیں اس حالت میں موت آجاتی تو تم جہنم میں چلے جاتے۔

فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا سو اُس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی۔

بسبب اسلام کے اور 'عِنْهَا' میں ضمیر حُفْرَۃ کے لیے ہے یا النَّارِ کے لیے ہے یا شَفَا (کنارے) کے لیے ہے مگر (شَفَا مذکر ہے اور یہ مؤنث ہے۔ تو ہو سکتا ہے شَفَا حفرۃٍ میں) مضاف الیہ کا اعتبار کرکے ضمیر مؤنث لائے یا اس لیے کہ شَفَا بمعنی شَفَةٌ ہو کیونکہ شفا اور شفة دونوں کنوئیں کے کنارے کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے لفظ جانب اور جانبة ہے۔ اور اس کا اصل "شَفَوٌ" ہے پھر واؤ کو بصورت مذکر الف سے بدل دیا اور مؤنث میں (تلئے تانیث کا اضافہ تو کیا مگر) 'الف' کو حذف کر دیا گیا۔

كَذٰلِكَ اسی طرح۔

جیسے بیان کر دیا گیا۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کرکے بتلاتے رہتے ہیں۔

یعنی اپنے دلائل۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

(اللہ تعالیٰ کا) ارادہ یہ ہے کہ تم ہدایت پر ثابت قدم رہو اور اس میں پختگی حاصل کرسکو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں۔

یہاں 'مِنْكُمْ' میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے کیونکہ تبلیغ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) فرض کفایہ ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ہر شخص اس کام کی

صلاحیت نہیں رکھتا اس لیے کہ جو آدمی اپنے آپ کو اس فرض کے لیے تیار کرتا ہے اُس کے لیے کچھ شرائط ہیں جس میں تمام افرادِ اُمّت مشترک نہیں (کسی کو مکلّف اُس وقت قرار دیا جاتا ہے جب اُس میں اہلیّت ہو) اور وہ شرائط یہ ہیں کہ احکام کا علم رکھتا ہو اور جانتا ہو کہ کسی کو کس وقت ٹوکا جائے اور یہ کہ اِقامتِ حُدود کیسے ہوگی پھر اُن کے قائم کرنے کی قُدرت بھی رکھتا ہو۔ خطاب سب کو ہے مگر اُن میں سے بعض کا فعل مطلوب ہے اس لیے کہ بتا دیا جائے کہ یہ فعل واجب تو سب پر ہے اگر سب ترک کر دیں گے تو سب گنہگار ہوں گے مگر اُن میں سے بعض کے کرنے سے باقی سب سے ساقط ہو جائے گا اور یہی حال ہے سب فُروض کفایہ کا۔ یا مِن بیانیہ ہے کہ تم ایک دعوت دینے والی اُمّت بن جاؤ جیساکہ فرمایا: کنتم خیر امۃ اخرجت الناس تامرون بالمعروف

اور دُعا الی الخیر عام ہے دعوۃ کو اُن امور کی جانب جن میں دینی بھلائی ہو یا دنیوی فائدہ ہو اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو دعوۃ الی الخیر پر معطوف کیا گیا یہ عطف ہے خاص کا عام پر کہ بتا دیا جائے کہ (دعوۃ الی الخیر کا رکن ہوتے ہوئے بھی) باقی امور پر اُن کو فضیلت ہے۔

وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور ایسے لوگ پُورے کامیاب ہونگے۔

یہی لوگ کمالِ فلاح سے مخصوص ہیں (اُولٰٓئِکَ اشارہ اور مشارٌ الیہ۔ المفلحون کے درمیان ضمیر ھُمْ لائی گئی تاکہ حصر پیدا کرکے تخصیص کی جائے)۔ منقول ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ "لوگوں میں سے سب سے اچھا کون ہے؟" فرمایا: وہ جو اُن میں سب سے زیادہ امر بالمعروف کرنے والا، سب سے زیادہ نہی عن المنکر کرنے والا، سب سے زیادہ شرعی احتیاط (تقویٰ) کی زندگی بسر کرنے والا اور سب سے زیادہ رشتے کو جوڑنے والا ہے" اور اُمور

واجبہ میں امر بالمعروف واجب ہوتا ہے اور امورِ مستحبہ میں مستحب ــــ (یعنی فرض کا امر کرنا فرض اور مستحب کا امر کرنا مستحب ہے) جبکہ نہی عن المنکر ہر طور پہ واجب ہے۔ کیونکہ تمام امور جن سے شرع پاک نے روکا ہے وہ حرام ہیں (یعنی حرام میں مباح و مکروہ نہیں جیسے کنوئیں میں گرنے والے کو بچانا ہر حال میں واجب ہے۔) اور زیادہ صاف اور واضح بات یہ ہے کہ گناہ کرنے والے کو بھی چاہیے کہ دوسروں کو اُس گناہ سے بھی روکے جس کا وہ خود ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اُس پر دو کام واجب ہیں: ایک اُس گناہ کا چھوڑنا اور دوسرے اُس سے روکنا۔ تو ایک کے ترک سے دوسرے کا وجوب ساقط نہیں ہوتا۔ (لم تقولون ما لا تفعلون میں بھی عمل بالقول کی ترغیب و تشویق ہے نہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نہی)۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا اور تم اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا۔ جیسے یہود و نصاریٰ نے توحیدِ باری تعالیٰ میں اختلاف کیا اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ (اُس کے صفات کو شرک وغیرہ سے پاک جاننا) اور احوالِ آخرۃ کے بارے میں باوجود جاننے کے اختلاف کیا۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ اُن کے پاس احکامِ واضحہ پہنچنے کے بعد۔

یعنی آیات اور دلائل جو حق کو واضح کرنے والے ہیں اور ضروری طور پر اُن پر (سب ہیں) اتفاق ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں (تفریق و اختلاف سے) نہی فروع کو چھوڑ کر اصول کے لیے خاص ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: "میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔" اور یہ بھی فرمایا کہ "جس شخص نے اجتہاد کیا

اور اُس کا اجتہاد صحیح ہوا تو اُس کے لیے دو اَجر ہیں اور جس کا اجتہاد (نیک نیتی کے باوجود) غلطی پر مُنتج ہوا اُس کے لیے ایک اجر ہے۔"

وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور اُن لوگوں کے لیے سزائے عظیم ہوگی۔

یہ عذاب کا وعدہ ہے اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے تفریق پیدا کی۔ اور دھمکی اور ڈر دلانا مقصود ہے اُن کو جنہوں نے اُن کی مُشابہت اختیار کی۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوهٌ اُس روز کہ بعض چہرے سفید ہو جائیں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔

یہ منصوب ہے اُس معنیٰ فعل پر جو لَهُمْ میں ہے یا يَوْمَ سے پہلے اُذکر مقدر محذوف ہے اور چہروں کا سفید ہونا یا سیاہ ہونا کنایے ہیں خوشی اور مسرّت کے اظہار سے اور خوف و دل گرفتگی کے آثار سے اور کہا گیا کہ اہلِ حق چہرے اور ماتھے کی چمک اور طبیعت کی شگفتگی اور سامنے اور سیدھے ہاتھ روشنی ہونے سے پہچانے جائیں گے اور اہلِ باطل اس کے برعکس۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کیا تم لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد۔

یہاں قول مراد ہے یعنی اُن سے کہا جائے گا کیا تم نے کفر کیا تھا۔ اور اَکفرتم میں ہمزہ جھڑکنے اور تعجب ظاہر کرنے کے لیے ہے اُن کے حال پر اور وہ جماعت مرتدین ہے[۱] یا اہلِ کتاب جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو نہ مانا بعد اس کے کہ وہ آپ کی بعثت سے قبل آپ پر ایمان لاچکے تھے یا[۲] اس سے مطلقاً تمام کفّار مراد ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے روزِ

میثاق اقرار کیا تھا اور اب وہ ایمان نہ لائے تھے۔ یا تمام کا فر مُراد ہیں جنہوں نے دلائلِ نبویّہ اور آیاتِ الٰہیّہ کی جانچ پرکھ کر کے یقین کر لیا تھا مگر داخلِ اسلام نہ ہوئے۔

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ سو سزا چکھو۔

یہ اُن کو ذلیل و رُسوا کرنے کی خاطر حکم دیا۔

بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ بسبب اپنے کفر کے۔

یا اپنے کفر کے بدلے میں۔

وَأَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اور جن کے چہرے سفید ہو گئے ہونگے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔

یعنی جنّت اور ہمیشہ کے فائدے اور بھلائی میں ہونگے۔ اسے رحمت سے تعبیر کیا تنبیہ کرنے کی خاطر کہ مؤمن بھی اگرچہ اُس نے ساری عمر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں گزار دی ہو جنّت میں نہیں داخل ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل نہ ہو۔ اور ترتیب کا حق تو یہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کا ذکر لایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آغازِ کلام اور انتہائے کلام ہر دو مقام پر اہلِ ایمان لوگوں کی حسنِ جزاء اور ثواب کا ذکر ہو۔

هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ وہ اُس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اسے نئے جملے کے طور پر لایا گیا تاکہ اس سے تاکید ظاہر کی جائے گویا کہا گیا "وہ وہاں کیسے رہیں گے" تو جواب میں فرمایا "وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔"

تِلْكَ اٰيَاتُ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں۔

جو نیکی کے لیے اجر و ثواب کے وعدے اور گناہ و برائی کے لیے عذاب کی دھمکی بتا رہی ہیں۔

نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ جو صحیح صحیح طور پر ہم تمہیں پڑھ کر سناتے ہیں۔
یہ خالص حق ہی کا لباس اختیار کیے ہیں کسی اور بات کا ان میں اشتباہ بھی نہیں۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے۔

کیونکہ ظلم اُس سے محال ہے وجہ یہ ہے کہ اُس پر کچھ واجب نہیں جس میں کمی سے اُس پر ظلم کا اطلاق ہو سکے اور نہ اُسے کوئی کسی کام سے روک سکتا ہے کہ اُس کے کرنے میں وہ ظلم کرنے کیونکہ وہ تو مطلقاً (بلا کسی قید و شرط کے) مالک ہے جیسے کہ اُس نے فرمایا

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کیے جاویں گے۔

لہٰذا وہ ہر شخص کو جو اُس نے وعدہ کیا ہے دے سکتا ہے اور جس عذاب کی دھمکی دی ہے وہ کر سکتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ تم لوگ اچھی جماعت ہو۔

یہ آیت اُن کے ماضی میں بہتر ہونے پر دلیل ہے اور اُن کے اس بہتر ہونے کے عہد کو ختم ہونے پر دلالت نہیں کرتی جیسے کہ فرمایا: وکان اللہ غفوراً رحیما (اور اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور مہربانی کرنے والا تھا) اور کہا گیا ہے کہ [1] تم اللہ تعالیٰ کے علم میں بہتر تھے یا [2] لوح محفوظ میں ایسا درج تھے یا [3] امم سابقہ میں ایسے تھے۔

أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ وہ جماعت لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔

یعنی تم ایسی بھلی جماعت ہو کہ تمہیں لوگوں کے لیے ظاہر کیا گیا ہے۔

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بُری باتوں سے روکتے ہو۔

جملہ مستانفہ ہے جس سے اُن کے خیر اُمّت ہونے کی توضیح کی ہے یا کُنْتُمْ کی خبر ثانی ہے۔

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔

ایمان میں وہ تمام اُمور شامل ہیں جن پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ اُن پر ایمان لانا ضروری ہے اور جب تمام امور پر جن پر ایمان لانا ضروری ہے ایمان حاصل ہو جائے تو اُسے ایمان کہتے ہیں اور ایمان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مؤخر کر دیا ہے حالانکہ حق یہ تھا کہ اس کا ذکر پہلے کیا جائے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ اس سے دلالت کی جائے کہ اُن کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اُس کی تصدیق کرنے ہی کے سبب سے ہے اور اپنے دین کے ظاہر کرنے کی غرض سے ہے۔ اور اس آیت سے دلیل ملتی ہے کہ اجماع حجّت ہے کیونکہ یہ اُن کے ہر نیکی کے حکم کرنے پر اور ہر بُرائی سے روکنے پر مقتضی ہے کیونکہ اس میں لام استغراق کے لیے ہے۔ تو اگر وہ باطل پر جمع ہو جائیں تو یہ بات اس آیۃ کے خلاف ہو گی۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے۔

ایسا ایمان جس کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ تو اُن کے لیے زیادہ اچھا ہوتا۔

یہ ایمان اُن کے لیے اُس چیز سے بہتر ہوتا جس پر یہ ہیں۔

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ اُن میں سے بعض تو مسلمان ہیں۔

جیسے کہ عبداللہ بن اسلام اور اُن کے ساتھی۔

وَ اَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ اور زیادہ اُن میں سے کافر ہیں۔

جو اپنے کفر میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ جملہ اور آئندہ جملہ ضمنی طور پر وارد ہوئے ہیں۔

لَنْ یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذًی وہ تمہیں ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے مگر ذرا خفیف سی اذیت۔

جیسے طعن و تشنیع اور دین میں دھمکی دینا وغیرہ (تنوین اذًی برائے تحقیر ہے)

وَاِنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ یُوَلُّوْکُمُ الْاَدْبَارَ اور اگر وہ تم سے مقابلہ کریں تو تم کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں۔

یعنی شکست کھا جائیں گے اور تمہیں قتل اور اسیری وغیرہ کا کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ پھر کسی طرف سے اُن کی حمایت بھی نہ کی جاوے گی۔

یعنی پھر وہاں کوئی ایسا نہ ہوگا جو تمہارے خلاف اُن کی مدد کرے اور تمہارے خوف کو اُن سے دُور کر سکے۔ یہاں ضرر کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ تمہیں صرف بات چیت سے دُکھ پہنچائیں گے (عملی اقدام نہ کر سکیں گے) اور مزید اس کے ثابت کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر وہ لڑائی کے لیے آمادہ ہوئے تو شکست اُنہی کے حصے میں ہوگی۔ پھر یہ بتا دیا کہ انجام کار وہ عاجز و ناکام ہوں گے اور اسے ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْا بھی پڑھا گیا بصورت اس کے کہ یہ پر عطف ہے اور یہاں (تراخی فی الزمان نہیں بلکہ) تراخی فی الرتبہ کے لیے ہے کہ یوں تو لوگ اُن کی مدد کرتے رہیں گے مگر جب آپ سے قتال کریں گے اُس وقت اُن کی مدد کو کوئی نہ پہنچ سکے گا۔ اور یہ آیت اُن غیب کی باتوں میں سے

ہے کہ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔ بنی قریظہ کو قتل کر دیا گیا، بنی نضیر اور بنی قینقاع کو جلاوطن کر دیا گیا اور یہودِ خیبر پر جزیہ لگا دیا گیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ جما دی گئی اُن پر بے قدری (یعنی بے امنی جان کی)۔

اور ذلت کو اُن پر مسلط کر دیا گیا کہ اُن کے جان و مال اور اہل وعیال غیر محفوظ کر دیئے گئے یا ذلت یہ کہ ہمیشہ کے لیے باطل کی علمبرداری انہی کے حصہ میں آئی یا اُن پر (ہمیشہ کے لیے) جزیہ (اور ٹیکس) لگا دیا گیا (جو اُن کے لیے باعثِ ذلت تھا)۔

أَيْنَمَا ثُقِفُوا جہاں کہیں پائے جائیں گے۔
(وہیں اُن پر ذلت کو تسلط ہو گا)۔

إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے۔

(اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ کا معنی صرف عبادت میں شغف ہونا ہے کہ مسلمانوں سے لڑنے وغیرہ کا قصد نہ کرے) یہ استثنا، تمام حالتوں میں سے ایک خاص حالت کا ہے کہ وہ ہر حالت میں ذلیل و رسوا رہیں گے اِلّا یہ کہ وہ اللہ کے عہد کو مضبوطی سے پکڑ لیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کوئی ضمانت حاصل ہو جائے یا اُس کتاب توراۃ وغیرہ پر عامل ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو دی ہے (اور وہ عمل بالقرآن کو مستلزم ہے) یا انہیں مسلمانوں کی طرف سے ذمہ داری حفاظت وغیرہ کا معاہدہ حاصل ہو جائے یا وہ دینِ اسلام میں داخل ہو جائیں اور مسلمانوں کی راہ کی پیروی کریں (یعنی مسلمان ہو جائیں تو

اُن کے حقوق بھی بعینہٖ مسلمانوں کے سے ہو جائیں گے)۔

وَ بَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے۔

اور وہ اللہ کے غضب کا شکار ہو کر واپس لوٹے کیونکہ اُس کے مستحق ہوگئے تھے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ اور جما دی گئی اُن پر پستی۔

مسکینی اُن پر اس طرح محیط ہے جس طرح خیمہ محیط ہوتا ہے اُن لوگوں پر جو اُس کے اندر بیٹھے ہوتے ہیں (تنگدستی اُن پر اپنے خیمے تانے ہے) اور (مفسرین کا بیان ہے کہ) یہود اکثر و بیشتر غربا و مساکین ہیں۔

ذٰلِكَ یہ (ذلت و پستی وغیرہ)

یعنی ضرب ذلّہ اور مسکنہ اور غضب کا استحقاق۔

بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکامِ الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق۔

یعنی سبب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات (کا کفر کرتے اور اُس کے احکام) نہ مانتے تھے اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے تھے اور بغیر حق کی قید اس لیے لگائی کہ ہو سکتا ہے وہ تو ایسا کوئی معاملہ نہ کریں جس سے وہ مستحق قتل ہوں کیونکہ ایسی حرکت انبیاء سے نہیں ہو سکتی مگر اُن کا قتل اُن کے دین میں بھی جائز نہ تھا۔

ذٰلِكَ (اور) یہ

(جذبۂ) کفر و قتل (کیونکر اُن میں پیدا ہوا؟)

بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں

نے اطاعت نہ کی اور دائرہ سے نکل نکل جاتے تھے۔

وہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان تھے اور حُدودِ خداوندی سے تجاوز کرنے کے عادی ہو چکے تھے کیونکہ صغیرہ گناہوں پر اِصرار کبیرہ گناہوں تک لے جاتا ہے اور کبیرہ گناہوں کا بار بار کرنا کفر تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کا معنٰی یہ ہے کہ ذلّت و رسوائی اس دُنیا میں اُن پر مسلّط کی گئی اور آخرت میں اُن کے لیے غضبِ (خداوندی) لازم کیا گیا۔ یہ اُن کے کفر اور قتلِ انبیاء کا نتیجہ تھا اور یہ اُس سبب سے تھا جو وہ نافرمانی کرتے تھے اور حُدودِ خداوندی سے تجاوز کر جاتے تھے۔

لَيۡسُوۡا سَوَآءً ؕ یہ سب برابر نہیں۔

یعنی یہ سب (اہلِ کتاب) بُرائی میں برابر نہیں۔ لَيۡسُوۡا میں ضمیر اہلِ کتاب کی طرف لوٹتی ہے۔

مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآٮِٕمَةٌ ان اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں۔

یہ نیا جملہ ہے جو اہلِ کتاب کی آپس میں برابری کی نفی کرتا ہے اور قَآئِمَةٌ کا معنی ہے سیدھی راہ چلنے والی اور انصاف پسند (جماعت) جیسے کہا جاتا ہے أَقَمۡتُ الۡعُوۡدَ فَقَامَ (میں نے لکڑی کو سیدھا کیا اور وہ سیدھی ہو گئی) اور یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اُن میں سے مسلمان ہو گئے۔

يَتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ

اللہ کی آیتیں اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔

قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تہجّد (کے نوافل) میں، اسے یُوں تعبیر کیا کہ وہ رات (کی گھڑیوں) میں سجدے کرتے ہیں اور تلاوت کرتے ہیں تاکہ زیادہ

واضح ہو جائے اور اُن کی تعریف میں مبالغہ کیا جائے اور کہا گیا ہے کہ اس سے نمازِ عشاء مراد ہے کیونکہ اہلِ کتاب کے ہاں عشاء کی نماز نہ تھی جیسا کہ روایت ہے کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تاخیر فرمائی اور پھر تشریف لائے لوگ نماز کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ فرمایا کہ جان لو کہ تمہارے سوا اس وقت میں کوئی بھی اہلِ مذہب اللہ کی عبادت نہیں کرتا۔

يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ

اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں۔

یہ "اُمَّۃٌ" کی مزید صفات ہیں جن میں اُن کی تعریف کی گئی ایسے خصائص کے ساتھ جو یہود میں نہ تھے کیونکہ وہ تو حق سے پھر گئے تھے اور رات کو عبادت نہ کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے تھے، اُس کی صفات میں بھی الحاد کرتے تھے اور آخرت کے دن کو اس طرح بتاتے تھے کہ حقیقۃً اُس طرح نہیں گناہوں پر گرفت میں نرمی کرتے اور نیکی کرنے میں سستی و غفلت سے کام لیتے تھے۔

وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ اور یہ لوگ شائستہ لوگوں میں سے ہیں۔

یعنی یہی لوگ ایسی صفات سے متصف ہیں کہ جن سے اُن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے نزدیک صالح ہو گئے ہیں اور وہ اُس کی رضا اور تعریف کے مستحق ہو گئے ہیں۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ تُكْفَرُوهُ اور تم لوگ جو نیک کام کرو گے اُس سے محروم نہ کیے جاؤ گے۔

یعنی نہ ہی تو اُن کے وہ اعمال (بالکل) ضائع ہونگے اور نہ ہی اُن کے اجر و ثواب میں کچھ کمی کی جائے گی ضروری طور پر، جس طرح پورے پورے

اجر و ثواب دینے کو شکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی طرح ثواب میں کمی یا ضیاع کو "کفر" سے تعبیر کیا اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے کیونکہ اس میں حرمان (محروم کرنے) کا معنی پایا جاتا ہے۔ اور حفص، حمزہ اور کسائی نے (دونوں جگہ) ضمیر غائب "وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْهُ" پڑھا ہے اور باقی قرائنے تا سے پڑھا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ اور اللہ تعالیٰ اہلِ تقوٰی کو خوب جانتے ہیں۔

یہ اُن کے لیے خوشخبری (بشارۃ بثلاثۃ حرکات الباء) ہے اور انہیں جتلانا ہے کہ تقوٰی ہی ہر بھلائی اور حسنِ عمل کی بنیاد ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ تقوٰی (شرعی احتیاط کی زندگی بسر کرنے والے) ہی کامیاب ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا جو لوگ کافر رہے ہرگز اُن کے کام نہ آویں گے اُن کے مال اور اُن کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ذرا بھی۔

(شیئًا من العذاب، عذاب سے) تھوڑا سا فائدہ اور بچاؤ بھی نہیں کریں گے یا شَیْئًا بمعنٰی غَنَاءً (فائدہ) مفعول مطلق ہے کہ یہ لَنْ تُغْنِیَ کے مادّہ سے مصدر ہے۔

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں۔

وہ اس کے ساتھ لزوم رکھیں گے، جدا نہ ہونگے، مفارقت نہ ہوگی۔

هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ وہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔

مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ اُس کی حالت جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں۔

کفار جو دولت خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے تقرب کی خاطر یا ایک

دوسرے پر فخر اور نیک شہرت کے لیے یا جو منافقین صرف کرتے ہیں دکھلاوے کے لیے یا خوف سے (کہ اُن کا راز فاش نہ ہو جائے)۔

فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ

دُنیوی زندگانی میں اُس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو۔

اس کا عام اطلاق تو ٹھنڈی ہوا پر ہوتا ہے جیسے صَرْصَرٌ۔ یہاں صِرٌّ اَی الریح البارد ہی کافی تھا مگر ساتھ ہی رِیْحٌ کا لفظ بھی استعمال ہوا۔ اس کی دو توجیہات ہیں: ایک تو یہ کہ یہ مصدر ہے جو تاکید کی خاطر لایا گیا یا یہ کہ یہ خود صیغۂ لغت صفت ہے جیسے مبالغہ کی خاطر لائے ہیں کہ شدید ٹھنڈک۔ جیسے کہا جاتا ہے بَرْدٌ بَارِدٌ (خوب ٹھنڈا)۔

اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنھوں نے اپنا نقصان کر رکھا ہو۔

یعنی اُنھوں نے کفر و ناشکری اور نافرمانی کرکے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو۔

فَاَهْلَكَتْهُ پس وہ اُس کو برباد کر ڈالے۔

اُن کو عذاب دینے اور سزا دینے کی خاطر اُن کے کھیت کو تہس نہس کر دے۔ اور غضب و غصّے کے عالم میں خراب کرنا زیادہ شدید ہوتا ہے۔ یہاں اُن کی خرچ کردہ دولت کو کفار کی اُس کھیتی کے ساتھ تہس نہس ہونے میں تشبیہ دینا مقصود ہے جس پر ٹھنڈی (بربادکُن) ہوا چلی اور اُسے تباہ و برباد کر دیا اور اُن کے لیے کوئی منفعت باقی نہ رہی، دنیا میں نہ آخرت میں اور یہ تشبیہ المرکب بالمرکب کے قبیل سے ہے۔

(تشبیہ مفرد بالمفرد میں حرف تشبیہ مشبہ بہ کے ساتھ ہوتا ہے جیسے زَیْدٌ کَالْاَسَدِ مگر مرکب میں یہ ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں حرف تشبیہ

"کمثل" کو مشبہ بہ "حرث" کی بجائے "ریح" کے شروع میں رکھا گیا) بصورتِ دیگر یہاں ریح کے شروع میں "مُهلك" مقدر ماننا پڑے آئی کمثلِ مُهلكِ ریحٍ اور اس صورت میں کلمہ تشبیہ مشبہ بہ کے ساتھ ہی ہوگا اور مُهلكِ ریحٍ سے حرث ہی مقصود ہوگا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان خرچ کرنے والوں پر (خواہ وہ کفار میں سے ہوں یا منافقین ریاکاروں میں سے) ظلم نہیں کیا کہ اُن کی اس خیرات و صدقہ کو ضائع کر دیا بلکہ اُنہوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے کیونکہ اُنہوں نے اس طریق پر خرچ ہی نہیں کیا جسے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول کیا جاتا۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کھیتی والوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے ایسے اعمال کا ارتکاب کیا تھا جس سے وہ اس عقوبت و انجام کے مستحق ہوئے۔

بعض نے لٰكِنَّ نون مشددہ پڑھا ہے اور ضمیر شان محذوف قرار دی ہے یعنی اصل میں یہ تھا ولکنّہم (وہ ضمیر مذکر جس کا مرجع نہ ہو ضمیر شان اور ضمیر مؤنث جس کا مرجع نہ ہو ضمیرِ قصہ کہلاتی ہے) مگر یہ درست نہیں کیونکہ ولکنّ پڑھنے سے ضمیر شان بھی مقدر ماننا پڑے گی مگر اس کے ساتھ خبر کی بھی ضمیر ہونی چاہیے یعنی یظلمون کی بجائے یظلمونہا ہونا چاہیے تھا (کیونکہ لکنّ اسم و خبر دونوں چاہتا ہے اور لکن فعل تک ہی محدود ہو جاتا ہے۔ اور ضمیر شان بھی مقدر محذوف کسی ضرورت کے تحت ہوتی ہے۔ جیسے ضرورت شعری)۔ ہر حالت میں ضمائر شان و قصہ محذوف نہیں ہوتیں (کہ اُن کا پتا بھی نہ چل سکے) ہاں ضرورت شعری میں ایسا ہو سکتا ہے۔ ابوالطیب

نے کہا ہے وما کنتُ ممن یدخل العشقُ قلبه

ولکنّ من یبصر جفونك یعشق

{میں اُن لوگوں میں سے نہیں جن کے دلوں میں عشق آسانی سے راہ پاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو تمہاری آنکھوں کو دیکھ پاتا ہے اُسے عاشق ہوئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔) استشہاد یہ ہے کہ یہاں لکنّ کے بعد ضمیر شان محذوف مقدر ہے}

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً اے ایمان والو کسی کو صاحبِ خصوصیت مت بناؤ (یعنی ہمراز اور خاص امور انتظامی میں دخل دینے والا)۔

(بطانة کا معنی ہے) وَلیجة (راز دار) اور ولیجہ اُس شخص کو کہتے ہیں جسے آدمی اپنے راز اُس پر اعتماد کرتے ہوئے بتا دیتا ہے۔ بطانة (کپڑے کا استر) سے تشبیہ اُن کے قرب واتصال کی وجہ سے دی گئی ہے۔ اسی طرح شعار سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے جیسے آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: اَلْاَنْصَارُ شِعَارٌ وَالنَّاسُ دِثَارٌ (یعنی انصار تو شعار کی مانند ہیں جو بدن کے ساتھ (کپڑا) لگا رہتا ہے اور باقی لوگ دثار ہیں وہ کپڑا جو بدن پر سب سے اوپر ہوتا ہے)۔

مِنْ دُوْنِکُمْ اپنے سوا۔

کُمْ سے مراد مسلمان ہیں یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر۔ یہ (جار مجرور) لا تتخذوا سے متعلق ہے یا بطانةً کی صفت محذوفہ (بطانة) کائنة سے متعلق ہے۔

لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔

اور فساد پیدا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے (یألون کا مادہ) اَلْوٌ بمعنی تقصیر، کمی کرنا ہے۔ اسے حرف کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے (اور یہاں حرف بھی نہیں اور اس کے ساتھ یہ کہ مفعول بھی دو ہیں جیسے کہا جاتا ہے لَا اٰلُوكَ نُصْحًا (میں تیری بہی خواہی میں کوتاہی نہیں کروں گا) یعنی اس کلمہ کو عربوں میں متعدی اکثر استعمال کیا جاتا ہے اور بدو مفعول) اور اس سے معنٰی "منع" یا "نقص" کا لیا جاتا ہے۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ تمہاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں۔

یعنی تمہاری تکلیف و مصیبت کی۔ "عَنَت" کا معنی سخت تکلیف و مصیبت ہوتا ہے اور یہاں "ما" مصدریہ ہے۔

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ یعنی بغض اُن کے منہ سے ظاہر ہو پڑتا ہے۔

یعنی اُن کی باتوں سے (اُن کے سینوں کی) کینہ وری ظاہر ہے کیونکہ بغض (وعناد) کی زیادتی کی وجہ سے اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے۔

وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ اور جس قدر اُن کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے۔

قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ ہم علامات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے۔

جو رہنمائی کرتی ہیں ان امور پر کہ اخلاص (للہ) واجب ہے اور ایمانداروں کی دوستی لازم اور کافروں کی دشمنی ضروری۔

اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ اگر تم عقل رکھتے ہو۔

اور سمجھو ان باتوں کو جو تمہیں بیان کی گئیں۔ چاروں جملے (۱۔ لا یالونکم خبالا ۔۲۔ ودّوا ما عنتم ۔۳۔ قد بدت البغضاء من افواههم

وما تخفی صدورھم اکبر۔ ٤۔ قد بینا لکم الآیات ان کنتم تعقلون) بطور علّت بنا بر استیناف ذکر کیے گئے ہیں۔ یا پہلے تینوں جملے بطانۃ کی صفت کے طور پر آئے ہیں اور چوتھا نیا جملہ ہے۔

هَاأَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ ہاں تم ایسے ہو کہ اُن لوگوں سے محبّت رکھتے ہو اور یہ لوگ تم سے اصلاً محبّت نہیں رکھتے۔

یعنی تم ہی ایسے ہو کہ کافروں کو دوست رکھنے کی غلطی کر رہے ہو تحبونھم اور لا یحبونکم بیان ہے اُن (مسلمانوں) کی غلطی کا کہ وہ اُن سے دوستی میں غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ تحبّونھم دوسری خبر ہے (أنتم مبتدا، اُولآء پہلی خبر) یا یہ أولآءِ کی خبر ہے اور (أولاء تحبونھم) پورا جملہ أنتم کی خبر ہے جیسے تو کہتا ہے أنتَ زیدٌ تحبّہ یا تحبونھم صلہ ہے "اُولآءِ" کا یا حال واقع ہوا ہے اور اس میں معنیٰ اشارہ عامل ہے اور "أولآء" منصوب بھی ہو سکتا ہے اس فعل کی وجہ سے جس کی تفسیر بعد کا فعل کرتا ہے اور سارا جملہ بن کر أنتم کی خبر ہے۔

وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔

یعنی جنسِ کتب (سماویہ) کے ساتھ (تمہارا ایمان ہے) اور یہ لا یحبونکم سے حال واقع ہوا ہے معنیٰ یہ ہوگا کہ (وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے) حالانکہ تم اُن کی کتاب کے ساتھ بھی ایمان رکھتے ہو پھر تم کیوں اُنہیں دوست رکھتے ہو حالانکہ وہ تمہاری کتاب کو بھی نہیں مانتے اور اس میں توبیخ ہے کہ وہ زیادہ پختہ اور سخت ہیں اپنے باطل میں بہ نسبت تمہاری پختگی اور استقامت کے تمہارے ایمان میں۔

وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا اور یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں کہ

دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔

منافقت کی وجہ سے اور دھوکا دینے کی غرض سے۔

وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ

اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غیظ کے۔

حسرت و افسوس کی وجہ سے کہ وہ تمہاری تشفی کی جانب راہ نہ پا سکے۔

اب وہ اپنے غصّے کی آگ میں جل رہے ہیں۔ (یہ کنایہ ہے شدتِ غضب سے جو مجبوری کے وقت ہو۔ تھانوی)

قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ آپ کہہ دیجیے کہ تم مر رہو اپنے غصّہ میں۔

(تمہاری مراد پھر بھی پوری نہ ہو گی)

یعنی اُن کے لیے بد دُعا کیجیے کہ وہ اِسی غیظ و غضب میں جلتے رہیں دوام و زیادتی کے ساتھ جیسا کہ قوتِ اسلام میں اور اہلِ اسلام میں اضافہ ہوتا جائے گا حتٰی کہ وہ اسی حال میں ہلاک ہو جائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ بے شک خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں دلوں کی باتوں کو۔

چونکہ اللہ تعالیٰ سینوں میں چھپی باتوں کو جانتا ہے لہذا اُن کے سینوں میں جو بغض و کینہ چھپا ہے اُسے بھی جانتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ بھی داخلِ مقول ہو یعنی آپ اُن سے یہ بھی فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ تو جو تم غصے میں اُنگلیاں کاٹنے وغیرہ کو چھپاتے ہو اُس سے زیادہ مخفی باتوں سے بھی آگاہ ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان اللہ علیم الخ خارج از مقول ہو یعنی یوں فرمایا کہ اُن سے کہہ دیجیے کہ غصے میں مر جاؤ اور آپ میرے اُن کے رازوں پر ان مطلع کرنے کو عجیب نہ سمجھیں کہ میں تو اُن کے ضمائر میں چھپی باتوں کو بھی جانتا ہوں۔

اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو اُن کے لیے موجب رنج ہوتی ہے اور اگر تمہیں کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

یہ اُن کی انتہا تک پہنچی ہوئی عداوت کا بیان ہے کہ جو کچھ بھلائی یا فائدہ اُن (مسلمانوں) کو پہنچتا ہے اُس پر حسد کرتے ہیں اور جو کچھ تکلیف یا مصیبت اُن کو پہنچتی ہے اُس پر خوش ہوتے ہیں اور مسّ استعارہ ہے اِصابۃ سے۔

وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا اور اگر تم استقلال اختیار کرو۔

اُن کی عداوت کے بارے میں اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادات کے) مکلف ہونے کی مشقتوں کے بارے میں۔

وَتَتَّقُوۡا اور تقویٰ کے ساتھ رہو۔

یعنی بچتے رہو اُن (کفار، منافقین) کی دوستی سے اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے خدا کا خوف کرتے ہوئے۔

لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـئًا تو اُن لوگوں کی تدبیر تمہیں ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔

یعنی اللہ کے فضل و کرم سے تمہیں اُن کے مکر و فریب سے نقصان نہ پہنچ سکے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو صبر و تقویٰ سے کام لیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ جو شخص کسی کام میں برابر مشق و کوشش کرتا رہے گا صبر و تقویٰ سے کام لے گا تو جب اُس پر کوئی تکلیف آئے گی اُس سے کم اثر پذیر ہوگا اور دشمن کے مقابلے میں جری ثابت ہوگا اور لَا يَضُرُّكُمۡ میں 'راء' کا ضمہ 'ضاد' کے ضمہ کی پیروی اور ہمسائیگی کی وجہ سے آیا ہے ورنہ اصل میں

یہ جواب شرط ہونے کی وجہ سے ساکن یضرُرْ تھا اور پھر مُدَّ کی طرح
لَا یضُرُّ پڑھا گیا۔ (قواعد کے اعتبار سے اسے لَا یَضُرُّ بثلاثۃ الحرکات
بلکہ بسکون الراء الثانیہ بھی پڑھا جاسکتا ہے) اور ابن کثیر، نافع، ابوعمرو، اور
یعقوب نے اسے "لَا یَضِرْکُمْ" پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ ضَارَ یَضِیْرُ
ضَیْرًا سے ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال۔

از قبیل صبر و تقویٰ وغیرھما پر۔

مُحِیْطٌ احاطہ رکھتے ہیں۔

یعنی اُس کا علم محیط ہے پس وہ تمہیں بدلہ دے گا جس کے تم مستحق ہو۔
اور اسے "بِمَا یَعْمَلُوْنَ" بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ
اللہ تمہارے ساتھ اُن کی دشمنی کو جانتا ہے پس انہیں اس پر سزا دے گا۔

وَاِذْ غَدَوْتَ اور جبکہ آپ صبح کے وقت چلے۔

یعنی اُس وقت کو یاد کیجیے۔

مِنْ اَهْلِكَ اپنے گھر سے۔

یعنی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ سے۔

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مسلمانوں کو جمارہے تھے۔

وا۱ اُن کو اُن کی جگہوں میں اُتارتے تھے (TO TAKE POSITIONS) یا۲
صفیں درست کرتے تھے یا۳ مقامات متعین کرتے تھے۔ اور اِس کی تائید ہوتی ہے
اُس قراءت سے جس میں اسے المؤمنین کی بجائے "لِلمؤمنین" پڑھا گیا ہے۔

مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ مقامات پر مقاتلہ کرنے کے لیے۔

مقاعد سے مراد مواقف اور جگہیں (POSITIONS) ہیں اور کبھی کبھی

"مقعد" اور "مقام" دونوں مجازاً جگہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِی مَقْعَدِ صِدْقٍ (أی فی مقامٍ صادق) اور قبلَ اَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ (أی قبل ان تقوم من مكانك و تركهٗ)

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ اور اللہ تعالیٰ سب سُن رہے تھے۔

تمہاری باتوں کو۔

عَلِيْمٌ سب جان رہے تھے۔

تمہاری نیتوں کو۔

منقول ہے کہ مشرکین نے ۱۲ شوال ۳ھ بروز بدھ اُحد کے پاس پڑاؤ ڈالا تو رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مشورہ کیا اور اس موقع پر عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول کو بھی بلایا حالانکہ اس سے پہلے کبھی اُسے (مشورہ کے لیے) نہ بلایا تھا۔ تو اُس نے اور انصار کی اکثریت نے یہ مشورہ دیا کہ حضور! آپ مدینہ میں ہی قیام رکھیں اور (اُن سے قتال کے لیے) مدینہ سے باہر نہ نکلیں۔ بخدا ماضی اس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی ہم دشمن سے مقابلہ کے مدینہ سے باہر نکلے ہیں دشمن ہم پر فتحمند ہوا ہے اور جب ہم مدینہ میں ہی رہے اور دشمن (لڑنے کے لیے) یہاں داخل ہوا تو ہم ہی اُس پر غالب آئے۔ اور (یہ تو جاہلیت کے زمانے کی باتیں ہیں اور) اب تو آپ بھی ہمارے میں تشریف فرما ہیں لہذا آپ اُن (اُحد والوں) کو چھوڑ دیجیے اگر وہ (وہیں) ٹھہرے رہے تو ایک بُرے قید خانے میں ٹھہرے رہیں گے اور اگر وہ (یہاں) داخل ہوئے تو مرد اُن سے جنگ کریں گے اور عورتیں اور بچے اُنہیں پتھر ماریں گے۔ اور اگر وہیں سے واپس لوٹ گئے تو ناکام و نامراد واپس لوٹیں گے۔ بعض نے مشورہ دیا کہ (مدینہ میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں) باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

تو آپ نے فرمایا: مَیں نے خواب میں کچھ گایاں اپنے گرد ذبح ہوتے دیکھی ہیں تو مَیں نے اُس کی تعبیر کی ہے کہ بھلائی ہے (شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگا) اور میں نے اپنی تلوار کی دھار میں کچھ شکستگی دیکھی ہے تو میں نے اس کی تأویل ہزیمت کی ہے۔ پھر میں نے دیکھا ہے کہ گویا میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں ڈالا ہے تو میں نے اس کی تأویل مدینہ (کو واپسی) کی ہے۔ اب اگر تمہاری رائے ہو کہ ہم مدینہ میں رہیں اور اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں (تو اچھا ہے) اس پر بعض لوگوں نے، جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے اور آگے چل کر غزوۂ اُحُد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کا مرتبہ بخشا، کہا: "حضور ہمیں دشمن کے مقابلہ میں لے چلیے" اور انہوں نے اصرار کیا اس پر آپ (گھر میں) داخل ہوئے اور ہتھیار پہن لیے جب (اصرار کرنے والے) لوگوں نے یہ دیکھا تو اپنے اصرار پر نادم ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) جو آپ نے خود سوچا ہے وہی کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا: کسی پیغمبر کو یہ لائق نہیں کہ وہ ہتھیار پہن لے اور پھر لڑے بغیر انہیں اُتار دے۔ پھر آپ نے نمازِ جمعہ ادا کی اور ہفتہ کی صُبح اُحُد کی گھاٹی میں پہنچے اور وادی کی ایک جانب پڑاؤ کیا اور اپنی اور لشکر کی پُشت پر اُحد پہاڑ کو رکھا اور صفیں درست کیں۔ تیر اندازوں پر عبداللہ بن جُبَیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مأمور فرمایا اور حکم دیا کہ تم تیر اندازی سے ہمارا دفاع کرو ایسا نہ ہو کہ (ہم آگے اُن سے مصروفِ جنگ و جدال ہوں اور) وہ پیچھے سے چھپ کر ہم پر حملہ کر دیں۔

اِذْ هَمَّتْ جب دل میں خیال کیا۔

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ سے متعلق ہے یا اِذْ غَدَوْتَ سے بدل ہے۔

طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ تم میں سے دو جماعتوں نے۔

قبیلہ خزرج میں سے بنو سلمۃ اور قبیلہ اوس میں سے بنی حارثہ اور یہ دونوں لشکر کے دو بازو تھے۔

اَنۡ تَفۡشَلَا یہ کہ ہمت ہار دیں۔

اُنہوں نے بزدلی اور کمزوری کا مظاہرہ کرنا چاہا ـــ روایت ہے کہ حضور علیہ السلام تقریباً ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے اور اُن سے وعدہ فرمایا کہ اگر وہ صبر سے کام لیں گے تو فتح و نصرت ان کی ہوگی۔ پھر جب وہ بمقام شوط (ایک باغ کا نام) پہنچے تو عبداللہ بن اُبیؓ تین سَو آدمی لے کر جُدا ہو گیا اور کہنے لگا کہ کس بل بوتے پر ہم اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو کٹوائیں۔ عمرو بن حزم انصاری اُن کے پیچھے گئے اور کہا کہ میں تمہیں تمہارے پیغمبر کے متعلق اور تمہاری جانوں کے متعلق اللہ کا واسطہ دیتا ہوں اور دینِ اسلام کا واسطہ دیتا ہوں (جو تم نے اختیار کیا ہے) تو عبداللہ بن اُبَیؓ نے کہا: اگر ہم جنگ کرنا جانتے ہوتے (یا یوں کہا کہ اگر ہم یہ جانتے کہ اسے جنگ کا نام دیا جا سکتا ہے) تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ اس موقع پر ان دونوں قبیلوں نے ارادہ کیا کہ اُس (عبداللہ بن ابی) کا ساتھ دیں مگر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں (اِس غلطی کے ارتکاب سے) محفوظ رکھا اور وہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمرکاب رہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اِس (واپسی کے ارادے) پر پختگی اختیار نہ کی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کو اِس بات سے جو اُن کے دل میں کھٹکی تھی محفوظ رکھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ہو اور اللہ تعالیٰ اُن کا مددگار تھا تو کیوں وہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کرتے۔ (صحابہ کرام

پر خدا تعالیٰ کی کیسی عنایت تھی کہ بیانِ جُرم کے ساتھ اُنہیں بشارتِ ولایتِ خاصّہ بھی سُنادی۔ تھانوی)

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اور پس مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرنا چاہیے۔

یعنی اُنہیں چاہیے کہ تنہا اُسی پر بھروسہ کریں اور اُس کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ کریں۔ (غیر پر بھروسہ کرنے سے وہ اپنا مددکا ہاتھ اُٹھا لیتا ہے۔ اور جب تنہا اُسی سے امداد چاہی جائے تو) وہ مددگار بن جاتا ہے جس طرح

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ یہ بات محقّق ہے کہ حق تعالیٰ نے تمہیں بدر میں منصور فرمایا۔

یہاں بعض اُن اُمور کا یاد دلانا مقصود ہے جن میں توکّل اُنہیں مفید ثابت ہوا تھا۔ اور بدر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک چشمے کا نام تھا جو بدر نامی ایک شخص کی ملکیت تھا، بعد میں اُس چشمے کا نام بھی بدر پڑ گیا۔

وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ حالانکہ تم بے سروسامان تھے۔

نَصَرَكُمْ کی ضمیر منصوب سے حال ہے اور یہاں اَذِلَّة جمع قلت کا وزن لایا گیا ذلائل جمع کثرت کا وزن نہیں لایا گیا (حالانکہ وہ تعداد میں تین سو سے اوپر تھے) اس سے اُنہیں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ ذلت کے ساتھ ساتھ قلّت کا شکار بھی تھے کیونکہ اُن کا حال بہت پتلا تھا، اُن کے پاس سواریوں اور اسلحہ کی (حد درجہ) کمی تھی۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔

اور ثابت قدم رہو۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم شکر گزار رہو۔

شاید کہ تقویٰ کی وجہ سے تم اللہ تعالیٰ کے انعامات از قبیلِ نصرت وغیرہ جو اس نے تم پر کیے ہیں شکریہ ادا کر سکو۔ یا یہ کہ شاید اللہ تعالیٰ تم پر انعام فرمائے اور اُس کی وجہ سے تم اُس کا شکر ادا کرو۔ (گویا فرمایا فاتقوا اللہ لعلکم تُنعَمُون فتشکرون) اور شکر کو انعام کی جگہ رکھا کیونکہ انعام شکر کا سبب ہے (سبب کو ہٹا کر مُسبّب کو رکھ دیا)۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ جبکہ آپ مسلمانوں سے فرما رہے تھے۔

یہ نَصَرَکُمْ کا ظرف ہے (یعنی یہ اُس وقت کی بات ہے نصرت وغیرہ جب آپ مومنین سے فرما رہے تھے۔ اس میں دو صورتیں ہیں کہ یہ نصرت غزوۂ بدر کے متعلق ہو، یا غزوۂ اُحد کے بارے میں ہو) تو ہو سکتا ہے یہ اِذْ غَدَوْتَ، سے بدلِ ثانی ہو اس بنا پر کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول اَلَنْ یکفیکم اُحد کے دن واقع ہوا اور یہ قول صبر اور مخالفتِ احکام سے بچنے کے ساتھ مشروط تھا، تو جب وہ غنیمتوں کے بارے میں صبر کا مظاہرہ نہ کر سکے اور احکامِ رسول علیہ السلام کی مخالفت کر بیٹھے فرشتے امداد کے لیے نازل نہ ہوئے۔

اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ کیا تمہیں یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اُتارے جاویں گے۔

{ یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب آپ فرما رہے تھے کیا تمہارے لیے تین ہزار نازل کردہ فرشتے کافی نہ رہیں گے یعنی غزوۂ بدر میں — یا غزوۂ اُحد کے موقع پر جب آپ نے مسلمانوں کو پوزیشن دے دی۔ } یہ انکار ہے کافی نہ ہونے کا یعنی کافی ہونگے اور پھر حرفِ تاکید برائے نفی لایا گیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ فتح و نصرت سے کچھ مایوس سے تھے بسبب اپنی کمزوری اور قلت کے

اور دشمن کے قوی اور کثیر ہونے کے۔ کہا گیا ہے کہ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی پھر وہ تین ہزار ہو گئے اور پھر پانچ ہزار کی تعداد کو پہنچ گئے۔

اور ابن عامر نے اسے مُنَزَّلِينَ تشدید سے پڑھا ہے کہ اس سے تکثیر یا تدریج مُراد ہے (جو باب تفعیل کا خاصہ ہے)۔

بَلٰى ہاں، کیوں نہیں۔

بَلٰى اثباتی جواب ہے اَلَنۡ یکفیکم کا یعنی بَلٰى یکفیکم پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو صبر و تقویٰ کی شرط پر اور زیادہ امداد کا وعدہ فرمایا تاکہ اُنہیں صبر و تقویٰ پر ترغیب دلائی جائے اور اُن کے دلوں کو مضبوط کیا جائے لہٰذا فرمایا

اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَيَاۡتُوۡكُمۡ اگر تم مستقل رہو گے اور متّقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر آ پہنچیں گے۔

یأتوکم میں ضمیر فاعل سے مشرکین مُراد ہیں۔

مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا ایک دم سے۔

یعنی اِسی گھڑی اور یہ 'فَوۡر' مصدر ہے فَارَتِ الۡقِدۡرُ سے جب ہنڈیا جوش میں آجائے پھر اُسے سُرعت کے لیے اِستعارۃً استعمال کر لیا گیا۔ محاورے میں اس کا اِطلاق اُس حالت کے لیے کیا جاتا ہے جس میں کوئی مہلت اور ڈھیل نہ ہو۔ معنیٰ یہ ہے کہ وہ تم پر اسی وقت دھاوا بول دیں۔

يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو کہ ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے۔

جونہی وہ (مشرکین) تم پر حملہ کریں بغیر کسی مہلت اور تاخیر کے تمہارا پروردگار تمہاری مدد کو فرشتے بھیج دے گا۔ مُسَوِّمِین کا معنیٰ ہے معلمین یعنی علامت والے ہوں گے۔ یہ تسویم سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کی علامت کا ظاہر کر دینا جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام سے فرمایا "تَسَوَّمُوْا فَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ قَدْ تَسَوَّمَتْ" (تم بھی نشان لگا لو کیونکہ فرشتوں نے بھی نشان لگا لیے ہیں) یا تسویم کا معنیٰ اسامہ کی طرح چھوڑے ہوئے ہے۔ اور ابن کثیر اور ابو عمرو اور عاصم اور یعقوب نے واؤ کے کسرہ سے (مُسَوِّمِیْنَ) پڑھا ہے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لیے کی۔

یعنی تمہاری امداد جو اللہ نے فرشتوں سے کی ہے۔

اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ تاکہ تمہارے لیے بشارت ہو۔

یعنی تمہیں امداد کی بشارت کی غرض سے۔

وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ اور تاکہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جاوے۔

یعنی خوف سے (تمہارے دلوں کو) کچھ سکون حاصل ہو۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

یاد رکھو کہ فتح نہ تعداد کی کثرت سے ہوتی ہے نہ ہتھیاروں کی زیادتی سے (اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جب انسانوں کے ساتھ فرشتے بھی شریک جنگ ہو جائیں تو فتح حاصل ہو جائے) بلکہ یہ بھی ضرورت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجے (وہ بغیر اس کے بھی فتح و نصرت عطا فرما سکتا ہے۔) تاہم اس نے فرشتے

ہو دوسرے کا نہیں)۔

فَيَنْقَلِبُوْا خَائِبِيْنَ پھر وہ ناکام لوٹ جاویں۔

(ایسی حالت میں شکست خوردہ) واپس لوٹیں کہ اُن کی آرزوئیں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکی ہوں۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ آپ کو کوئی دخل نہیں۔

یہ جملہ معترضہ ہے۔

اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ یہانتک کہ خُدا تعالیٰ اُن پر یا تو متوجہ ہو جاویں اور یا اُن کو کوئی سزا دے دیں۔

اَوْ يَكْبِتَهُمْ پر معطوف ہے اور معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے معاملہ کا مالک ہے چاہے تو اُنہیں ہلاک کرے اور چاہے ذلیل و رُسوا کرے یا (اُنہیں توفیقِ اسلام دے کر اُن کی) توبہ قبول کرے یا (اُن کی توبہ قبول نہ کرے یا توفیق ہی توبہ کی نہ دے اور) اُنہیں عذاب دے، بصورتے کہ وہ کفر وعصیان پر اصرار کریں۔ اور لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ کا معنی یہ ہے کہ آپ تو ایک بندہ ہیں جو اُن کے ڈرانے اور (بصورت نہ ماننے کے) اُن سے جہاد کے لیے مامور کیے گئے ہیں۔ یا یہ معطوف ہے الامر پر یا شَيْءٌ پر۔ اور اِن دونوں صورتوں میں يَتُوْبَ اور يُعَذِّبَ سے پہلے اَنْ (مصدریّہ) مقدر ماننا پڑے گا (یعنی اِسمیّہ کا عطف اِسمیّہ پر ہوگا اور اس طرح لَيْسَ لَكَ من الامر شَيْءٌ جملہ معترضہ نہیں ہوگا)۔ پھر جب ہم "الامر" پر معطوف قرار دیں تو تقدیرِ عبارت یوں ہوگی لَيْسَ لَكَ من امرِهم اَوْ مِنَ التَّوْبَةِ عَلَيْهِم أو من تعذيبهم شيءٌ (آپ کو اُن کے معاملے میں یا اُن کی توبہ قبول کرنے میں یا اُن کو عذاب دینے میں کسی بات کا اختیار نہیں) اور جب ہم اسے

"شَیءٌ" پر معطوف قرار دیں گے تو تقدیر عبارت یوں ہوگی: لیس لك من أمرهم شَیءٌ أوالتوبةُ علیهم أو تعذیبُهم (آپ کو ان کے معاملے میں نہ کسی بات کا اختیار ہے نہ اُن کی توبہ قبول کرنا اور نہ اُن کو عذاب دینا) یا یہ کہ أوْ بمعنی إلاَّ أنْ کے ہو یعنی یہ کہ آپ کو اُن کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں اِلاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول کرے اور آپ اس سے خوش ہو جائیں یا اُنہیں عذاب دے اور آپ اُن سے خلاصی پا جائیں۔

شانِ نزول: روایت ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے جنگِ اُحد میں آپ کے سرِ مبارک پر چوٹ لگائی جس سے آپ کے سامنے کے دانت شہید ہو گئے، آپ اپنے چہرے سے خون پونچھتے تھے اور فرماتے تھے: کَیْفَ یُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِیِّهِمْ بِالدَّمِ (وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو لہولہان کر دیا) اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اُن کو بد دعا کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی وجہ سے حضور علیہ السلام کو اس ارادے سے منع فرمایا کہ (آگے چل کر) اُنھی میں سے ایمان لانے والے ہوں گے۔

فَإِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ بے شک وہ ظلم ہی بڑا کر رہے ہیں۔

وہ اپنے ظلم کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے۔

ہر چیز خلقاً و ملکاً اللہ ہی کی ہے (اُسی نے پیدا کی ہے وہی مالک ہے) جب وہ مالک ہے تو تمام اختیار بھی اُسی کا ہے آپ کا کوئی اختیار نہیں۔

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وہ جس کو چاہیں

بخش دیں اور جس کو چاہیں عذاب دیں۔

آیت کے اس ٹکڑے سے عذاب کے واجب ہونے کی نفی کی صراحت ہوتی ہے (یعنی اللہ چاہے گا تو معاف بھی کر دے گا اور سزا نہ دے گا) اور اس میں توبہ کرنے، نہ کرنے کی قید سے بھی نفی کی صراحت ہے (یعنی اُس کا اختیار لامحدود ہے لمن یشاء فرمایا کہ جسے چاہے توبہ کی ہو، نہ کی ہو بخش دے اور جسے چاہے پکڑ لے وہ مالک ہے ۱۲)۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت کرنے والے ہیں۔

اپنے بندوں پر، آپ اُن کے لیے بد دعا کرنے میں جلدی نہ کریں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً اے ایمان والو! سُود مت کھاؤ (یعنی نہ تو اصل سے) کئی حصے زائد (کر کے)۔

(یہاں کئی حصّے سود کے حرام ہونے کی قید نہیں کیونکہ سود قلیل و کثیر سب حرام ہے ۱۲) یعنی سُود کو (چند در چند) اضافوں کے ساتھ دوگنا چوگنا کر کے نہ کھاؤ اور یہ تخصیص (اَضعافاً مضاعفةً) باعتبارِ واقعہ ہے کہ (اُس وقت سُود در سُود جاری تھا) ایک شخص مقررہ مدت تک سُود پر قرض دیتا تھا پھر اُس میں اضافے کرتا جاتا تھا حتیٰ کہ تھوڑے سے قرض میں مقروض کا تمام مال و زر ختم ہو جاتا تھا۔ اور ابن کثیر، ابن عامر اور یعقوب نے (مضٰعَفَةً کو باب تفعیل سے) مضعَّفَةً پڑھا ہے۔ {سود مرکب کو زیادہ بُرا کہہ کر کھانے سے منع فرمایا۔ اس سے یہ نہیں نکلتا کہ سود مفرد جائز ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں بھائی کا قتل یا قتلِ اولاد حرام ہے یعنی قتل تو اصلاً بُرا ہے تو قتل الاخ اس سے بھی زیادہ بُرا ہو گا۔}

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

اُن امور کے بارے میں جن سے تمہیں روکا گیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ امید ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔

یعنی اللہ تعالیٰ سے فلاح کی امید رکھتے ہوئے اس سے ڈرتے رہو۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

(آگ سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ) کفار کی پیروی کرنے اور اُن کے جیسے افعال سے بچتے رہو۔ اور اس میں اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ نار (جہنم) اصل میں تو کافروں کے لیے ہی تیار کی گئی ہے مگر بالعرض (ضمنی طور پر ——————)
اس میں نافرمان مسلمانوں کو بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور خوشی سے کہنا مانو اللہ تعالیٰ کا اور رسول کا امید ہے کہ تم رحم کیے جاؤ گے۔

وعیدِ جہنم کے بعد وعدۂ رحمت کا ذکر فرمایا کہ اس سے نافرمانی احکام سے ڈرانا اور فرمانبرداری کی رغبت دلانا مقصود ہے۔ اور ایسے مواقع پر لَعَلَّ اور عَسٰی کا لایا جانا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اُس بات (یعنی رحمت) تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے جو لَعَلَّ کی خبر ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اور دوڑو۔

جلدی کرو اور آگے بڑھو۔

اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ طرف مغفرت کے جو تمہارے پروردگار کی جانب سے ہیں۔

یعنی ایسے امور کی طرف جلدی کرو جو مغفرت کا مستحق بناتے ہیں جیسے

(کفر سے) اسلام اور (گناہ سے) توبہ اور (شرک و ریا چھوڑ کر اعمال میں) اخلاص اختیار کرنا ـــــ اور نافع اور ابن عامر نے سَارِعُوْا سے پہلے واؤ نہیں پڑھی۔

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اور طرف جنّت کے جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین۔

یعنی جنّت کا عَرض ان دونوں کے عرض کی طرح ہے اور یہاں عرض کو ذکر کیا اُس کی فراخی کے وصف میں مبالغہ کی خاطر اور عرضِ سموات و ارض کو اُس کا مثیل قرار دیا طول کو نہیں (کہ جب جنّت کا عرض ناپنے کے لیے زمین و آسمان پیمانہ ہوا تو اُس کا طول ناپنے کا کوئی پیمانہ ہی نہیں۔) اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جنّت کا عرض ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ہیں جبکہ اُنہیں ایک ایک کر کے ایک دوسرے کے ساتھ رکھ دیا جائے۔ (فسبحان الخالق العظیم)۔

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

جنّت اُن کے لیے تیار کی جا چکی ہے (بصیغہ ماضی) اور اس میں دلیل ہے کہ جنّت مخلوق ہے اور یہ بھی کہ وہ اس عالَم سے خارج ہے (لِاَنَّ الصَّغِيْرَ لَا يَسَعُ الْكَبِيْرَ بڑی چیز چھوٹی میں نہیں سما سکتی)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ ایسے لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں۔

یہ[1] متقین کی صفتِ مادحہ ہے (اور اس صورت میں مجرور ہوگی) یا[2] مدح منصوبہ ہے (جبکہ اَمدَحُ محذوف مقدر مانا جائے) یا[3] (خبر ہے مبتدا محذوف "ھُمْ" کی اور) مرفوع ہے۔

فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ فراغت میں اور تنگی میں۔

یعنی دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں خوشحالی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی۔ یا یہ کہ ہر حال میں خرچ کرتے ہیں کیونکہ انسان ہمیشہ مسرت یا مضرت (دو میں سے ایک حال) میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ کسی حال میں بھی مقدور بھر چیز تھوڑی ہو یا زیادہ خرچ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور غصے کے ضبط کرنے والے ہیں۔

یعنی روکنے والے ہیں اپنے غصے کو باوجود قدرت رکھنے کے (محاورہ ہے كَظَمْتُ الْقِرْبَةَ إِذَا مَلَأْتَهَا یعنی) جب آپ مشکیزہ کو پانی وغیرہ سے بھر لیتے ہیں اور اُسے تسمے وغیرہ سے باندھ دیتے ہیں تو کہتے ہیں كَظَمْتُ الْقِرْبَةَ اور رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى إِنْفَاذِهٖ مَلَأَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ أَمْنًا وَّإِيْمَانًا (یعنی جو شخص غصہ پی جائے باوجودیکہ وہ اُسے پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے دل کو امن و ایمان سے بھر دے گا)

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔

(یعنی یہ لوگ درگزر سے کام لیتے ہیں اور) اُس شخص کی سزا کو بھی چھوڑ دیتے ہیں جو ہے، مواخذہ کرنے کا حق اُنھیں پہنچتا تھا اور آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: "هٰؤُلَاءِ فِيْ أُمَّتِيْ قَلِيْلٌ إِلَّا مَنْ عَصَمَ اللّٰهُ وَقَدْ كَانُوْا كَثِيْرًا فِي الْأُمَمِ الَّتِيْ مَضَتْ" (یعنی ایسے لوگ میری اُمت میں تھوڑے سے ہیں جنہیں اللہ محفوظ رکھے اور پہلی امتوں میں یہ زیادہ تھے۔ مگر فضیلت جزئی فضیلت کلی کے منافی نہیں)۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

المحسنین میں لامِ جنس کا بھی ہو سکتا ہے یعنی تمام احسان کرنے والے اور اُن کے تحت مذکورہ بالا محسنین بھی آجائیں گے اور لامِ عہد کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح صرف محسنینِ مذکورہ ہی مُراد ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو۔

بعد درجہ برا کام جیسے زنا۔

اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یا اپنی ذات پر نقصان اُٹھاتے ہیں

یعنی اُنہوں نے کوئی سا گناہ کیا ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الفاحشۃ سے مراد گناہِ کبیرہ ہے اور ظلم النفس سے گناہِ صغیرہ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الفاحشہ اس گناہ کو کہا گیا ہو جو متعدی اثر رکھتا ہو اور ظلم النفس وہ گناہ جو ایسا نہ ہو (بلکہ اپنی ذات تک محدود ہو)۔

ذَكَرُوا اللّٰهَ تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں۔

وہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ عذاب کو یاد کرتے ہیں یا (مطلقاً) اس کے احکام کو یاد کرتے ہیں یا اس کے حقوقِ عظیمہ کو یاد کرتے ہیں۔

فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں۔

نادم و پشیمان ہوتے ہیں اور توبہ کر لیتے ہیں۔

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہے۔

استفہام انکاری ہے اور یہ جملہ معترضہ ہے جو دو عطفی جملوں کے درمیان واقع ہوا ہے اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت کی فراخی اور اس کی بخشش

کے عموم کا بیان ہے اور استغفار پر اُبھارنا مقصود ہے اور قبولِ توبہ کا وعدہ دیا گیا ہے۔

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوْا اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے۔

یعنی وہ اپنے گناہوں پر اَڑے نہیں رہتے بلکہ معافی مانگ لیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَ اِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (جس نے معافی مانگ لی اُس نے اصرار نہیں کیا گرچہ اُس نے وہ فعل دن میں ستر بار کیا ہو)۔

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ جبکہ وہ جانتے ہوں۔

یہ وَلَمْ يُصِرُّوا سے حال واقع ہوا ہے یعنی وہ اپنے فعلِ قبیح پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے اور ایسے باغ ہیں ان کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی اور یہ ہمیشہ ہمیشہ اُن ہی میں رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا ---- کی خبر ہے بشرطیکہ اُسے مبتدا قرار دیا جائے یا جملہ مستانفہ ہے جو ماقبل کی وضاحت کرتا ہے بشرطیکہ اسے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ پر یا اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ پر معطوف قرار دیا جائے۔

اور یہ جو فرمایا کہ جنّت متّقین و تائبین کے لیے جزا کے طور پر تیار کی گئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مُصِرِّيْن (گناہوں پر اصرار کرنے والے) وہاں داخل نہیں ہوں گے جیسا کہ کافرین کے لیے اُن کی جزا کے طور پر جہنم تیار کر لی ہے

لازم نہیں آتا کہ غیر کا فر اُس میں داخل نہیں ہوتے۔

اور جَنّٰتٍ کو نکرہ لایا گیا پہلی صورت میں کہ یہ خبر ہو الّذین کی — اس سے دلیل ملتی ہے کہ جو کچھ اُن (تائبین) کے واسطے ہے وہ اُس سے کمتر ہے جو گزشتہ آیۃ میں مذکورہ صدر صفات سے متصف متقین کے لیے ہے اور تیرے لیے دلیلِ فارق دونوں میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی صفت میں الگ آیات نازل فرمائیں کہ وہ محسنین ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی محبت کو لازم پاتے ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ اُنھوں نے حُدودِ شرعیہ پر محافظت کی اور مکارمِ اسلام میں خصوصیت حاصل کی اور تائبین و مستغفرین کے لیے جداگانہ آیۃ میں تفصیل دے دی، چنانچہ فرمایا

وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ اور یہ اچھا حق الخدمت ہے اِن کام کرنے والوں کا۔

(اِن آیتوں میں دو درجوں کے مسلمانوں کا بیان ہے ایک اعلیٰ درجہ کے، ایک اُن سے کم، اور خدا سے ڈرنے والوں میں سب آگئے کیونکہ توبہ بھی خدا کے ڈر ہی سے ہوتی ہے۔ ۱۲ حاشیہ تھانوی)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ بالتحقیق تم سے قبل مختلف طُرق گزر چکے ہیں۔

ایسے واقعات جو اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے والی اُمتوں میں دکھائے جیسا کہ فرمایا: وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ اور وہ قتل کیے گئے خوب قتل کرنا (اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے) یہ طریقہ رہا اللہ تعالیٰ کا اُن لوگوں میں جو (تم سے) پہلے گزرے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ سُنَنٌ بمعنی اُمَمٌ ہے جیسے شاعر نے کہا ہے ؎

مَا عَايَنَ النَّاسُ مِنْ فَضْلٍ كَفَضْلِكُمْ
وَلَا رَأَوْا مِثْلَهٗ فِيْ سَالِفِ السُّنَنِ

(لوگوں نے کسی بزرگی و شرافت کا مشاہدہ نہیں کیا جو تمہاری بزرگی کے مانند ہو سکے (اور یہ تو اس زمانے کی بات ہے) وہ ایسی بزرگی گزشتہ امتوں میں بھی نہ دیکھ پائے تھے؟) یہاں سُنَنٌ بمعنی اُمَم استعمال ہوا ہے۔

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ تو تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ آخر انجام تکذیب کرنے والوں کا کیسا ہوا۔

تاکہ تم اُن کے ہلاک ہونے کے آثار دیکھ کر عبرت حاصل کرو۔

هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ یہ بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

یہ اشارہ ہے قَدْ خَلَتْ کی طرف یا فَانظُرُوا کے مفہوم کی طرف یعنی یہ مکذبین کے لیے بیان ہونے کے ساتھ ساتھ متقین کے لیے زیادتی بصیرۃ اور نصیحت (کا باعث بھی) ہے۔ یا هَٰذَا سے اشارہ اُس بیان کی طرف ہے جو متقین اور تائبین کا خلاصۃً مذکور ہوا اور قَدْ خَلَتْ جملہ معترضہ ہے جو ایمان اور توبہ پر ترغیب کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ هَٰذَا سے قرآن شریف کی طرف اشارہ ہے)۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو۔

غزوۂ اُحد میں جو اُنہیں تکلیف پہنچی اُس سے تسلی دلانا مقصود ہے اور معنی یہ ہے کہ بوجہ اُس مصیبت کے جو تمہیں پہنچی جہاد سے کمزور نہ پڑ جانا اور جو تم میں قتل ہوئے ہیں اُن پر (زیادہ) غمگین نہ ہو جانا۔

وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ اور غالب تم ہی رہو گے۔

یعنی[1] حال یہ ہے کہ تم اُن سے بلند شان کے مالک ہو کیونکہ تم حق پر ہو، تمہارا قتال اللہ کے لیے ہے اور تمہارے مقتولین جنّت میں ہیں اور وہ (کفار) تو باطل پر ہیں، اُن کا قتال شیطان کے لیے ہے اور اُن کے مقتولین جہنم میں ہیں۔ یا[2] تم اس لحاظ سے اُن سے بلند و برتر ہو کہ تم نے غزوۂ بدر میں جو اُنہیں نقصان پہنچایا تھا وہ اِس سے زیادہ تھا جو اُنہوں نے آج تمہیں پہنچایا ہے۔ یا[3] یہ کہ تم اُن سے اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہو انجام کے لحاظ سے، اس صورت میں گویا اُنہیں نصرت و غلبہ کی بشارت دی گئی۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ بشرطیکہ تم پورے مومن رہو۔

یہ[1] نہی یعنی لَا تَهِنُوْا سے متعلق ہے۔ معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر تمہارا ایمان صحیح ہے تو کمزوری نہ دکھاؤ کیونکہ دل کی قوۃ اللہ تعالیٰ پر بھروسے کی مقتضی ہے۔ یا[2] الاعلون سے متعلق ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو اِس قوم کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔

حمزہ، کسائی اور ابن عیاش نے بروایت عاصم ضمّ قاف سے (قُرْحٌ) پڑھا ہے اور باقی قُرّاء نے فتح قاف سے (قَرْحٌ) پڑھا ہے اور[1] یہ دونوں بولیاں ہیں جیسے الضَّعف اور الضُّعف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قَرْحٌ کا معنی ہے زخم وغیرہ اور قُرْحٌ سے زخم کی (جو) درد و تکلیف (ہوتی ہے وہ مُراد لی جاتی ہے) معنیٰ[1] یہ ہوگا کہ اگر اُنہوں نے غزوۂ اُحد میں تمہیں مبتلائے رنج و بلا کیا ہے تو تم بھی اُنہیں غزوۂ بدر میں اسی طرح مبتلائے عذاب کر چکے ہو پھر وہ تو کمزور نہیں پڑے اور اُنہوں نے بزدلی نہیں دکھائی تو تم زیادہ لائق ہو اس بات کے کہ کمزور نہ پڑو کیونکہ تم اللہ تعالیٰ سے ایسی امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے

[2] اور یہ بھی کہا گیا کہ (یہاں غزوۂ بدر مُراد نہیں بلکہ) دونوں جگہ غزوۂ اُحد ہی کے واقعات مُراد ہیں کیونکہ مسلمان رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مخالفتِ حکم سے پہلے کفار پر فتح پا چکے تھے۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ اور ہم اِن ایّام کو ان لوگوں کے درمیان اَدلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔

(نُدَاوِلُهَا کا معنیٰ ہے نصرّفها یعنی) ہم پھیرتے رہتے ہیں کبھی (فتح ونصرت کے) مواقع ایک گروہ کی طرف پھیر دیتے ہیں کبھی دوسرے کی طرف، کما قال الشاعر ؎

فَيَوْمٌ عَلَيْنَا وَيَوْمٌ لَنَا وَيَوْمًا نُسَاءُ وَيَوْمًا نُسَرُّ

(ایک دن ہمارے خلاف جاتا ہے اور (پھر ایسے مواقع آتے ہیں کہ) دوسرا دن ہمارے حق میں ہوتا ہے اور اس طرح کسی دن ہم تکلیف پہنچائے جاتے ہیں اور کسی دن خوشی پاتے ہیں۔

اور المداولة ' معاودہ کی طرح ہے (بمعنی بار بار پھیرنا) کہا جاتا ہے داولتُ الشئ بينهم فتداولوهُ (میں نے چیز کو ان میں ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کیا تو انہوں نے اُسے باری باری لے لیا) اور الایّام (تلك کی) [1] صفت بھی ہو سکتا ہے اور [2] خبر بھی اور نُداولها (بصورتِ اول) خبر ہوگا اور (بصورتِ دوم) حال ہوگا۔ اور ایّام سے مُراد فتح ونصرت کے مواقع ہیں۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیں۔

[1] اس کا عطف علتِ محذوفہ ہے یعنی نُداولها ليكون كيت

وَكَيْتَ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ (ہم گردشِ ایام اس لیے لاتے ہیں کہ فلاں فلاں مصلحتیں پوری ہوں اور یہ کہ اللہ کے علم میں ہو جائیں اہل ایمان) اور علت کو محذوف کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہاں کئی علتیں ہو سکتی ہیں (یعنی ہم زمانے کو بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے جن کا شمار نہیں بدلتے رہتے ہیں) اور مسلمان کو جو تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی اَن گنت مصلحتیں ہیں یا[۲] فعل معلّل بہ محذوف ہے۔ اصل عبارت ہوگی: وَلِيَتَمَيَّزَ الثَّابِتُوْنَ عَلَى الْاِيْمَانِ مِنَ الَّذِيْنَ عَلٰى حَرْفٍ فَعَلْنَا ذٰلِكَ یعنی ہم نے یہ اس لیے کیا کہ ثابت قدم اہل ایمان مطلب پرستوں سے ممتاز و منفرد ہو جائیں۔) اور اس قسم کی باتوں سے (کہ اللہ جان لے) اور ان کے برعکس باتوں سے اللہ تعالیٰ کے علم کا اثبات ونفی مقصود نہیں ہوتا بلکہ بطور برہان معلوم کا محل وقوع اور غیر وقوع مُراد ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اللہ کے علم سے مُراد وہ علم ہے جس پر جزاء مرتّب ہوتی ہے اور وہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے بعد کا علم ہے۔

وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ اور تم میں سے بعض کو شہید بنانا تھا۔
اس سے مراد شہدائے اُحد ہے یا[۲] (شہداء شاھد کی جمع ہوگی اور معنٰی یہ ہوگا کہ) تمہیں شاہدِ عدل قرار دے جیسا کہ وہ ثابت قدم اور تکالیف پر صابر پائے گئے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ اور اللہ تعالیٰ ظُلم کرنے والوں سے محبّت نہیں رکھتے۔

[۱](ظالمین سے مُراد وہ لوگ ہیں) جو دلوں میں ایسی باتیں پوشیدہ رکھتے ہیں کہ اُن کے خلاف ظاہر کرتے ہیں یا[۲] اس سے مراد کافر ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس میں خبردار کیا گیا ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کافروں کو نصرت عطا نہیں

فرماتے ہاں کبھی کبھی انہیں استدراجاً (گناہ میں زیادہ ڈال کر دوزخ میں ڈالنے کے لیے) غلبہ دے دیتے ہیں۔ اور اس سے دوسرا مقصد مسلمانوں کی آزمائش ہوتی ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور تاکہ میل کچیل سے صاف کردے ایمان والوں کو۔

یعنی اگر وہ مغلوب ہوجائیں تو اس طرح اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں سے پاک صاف اور مطہر کردے۔

وَيَمْحَقَ الْكَافِرِيْنَ اور مٹا دیوے کافروں کو۔

اور اگر نصرت کفار کے خلاف مسلمانوں کو حاصل ہو تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ کافر ہلاک ہوں۔ اور "اَلْمَحْقُ" کا معنی ہے کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا گھٹانا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں جا داخل ہوگے۔

(أَمْ منقطعہ ہے گویا) عبارت یوں ہوگی: بَلْ أَحَسِبْتُمْ (بلکہ کیا تم نے گمان کیا؟) اور اس کا معنیٰ انکار ہے۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو۔

(اللہ تعالیٰ کو ابھی اُن لوگوں کا علم نہیں ہوا جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں۔ یہاں علمِ الٰہی بالواسطہ مخلوق کی طرف ہے اور علم وجودی مُراد ہے یعنی) ابھی تک تم نے جہاد کیا ہی نہیں۔ اور اس آیۃ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد فرض علی الکفایہ ہے۔ اور لَمَّا اور لَمْ میں فرق یہ ہے کہ لَمَّا ہر فعل کی مستقبل

میں توقع ہوتی ہے (اور لَمْ میں ایسا نہیں) اور یَعْلَمَ (بفتحِ میم) بھی پڑھا گیا اس بناء پر کہ یہ اصل میں یَعْلَمَنْ تھا پھر نون حذف کر دیا گیا۔

وَيَعْلَمَ الصَّابِرِيْنَ اور نہ اُن کو دیکھا جو ثابت قدم رہنے والے ہوں۔

یَعْلَمَ منصوب ہے کیونکہ اِس سے پہلے أَنْ مقدر ہے اِس بناء پر کہ وَیَعْلَمَ میں "وَ" جمع (بین الجملتین) کی ہے (جس سے پہلے ہمیشہ أَنْ مقدر مانا جاتا ہے) (جیسے کہا جاتا ہے۔ لَا تَأْكُلِ السمنَ وَ تَشْرَبَ اللبن) اور اسے یَعْلَمُ (فعل مرفوع) بھی پڑھا گیا ہے اِس صورت میں واؤ حالیہ ہو گی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَمَّا تُجَاهِدُوْا وَ اَنْتُمْ صَابِرُوْنَ (یعنی ابھی تک تم نے اس حال میں جہاد کیا ہی نہیں کہ تم صبر کرنے والے ہو) — (واوِ جمع منصوب بہ محلاً اور واوِ حال مرفوع ہوتی ہے)۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ اور تم تو مرنے کی تمنا کر رہے تھے۔

(الموت سے مُراد) جنگ ہے کیونکہ وہ بھی اسبابِ موت میں سے ہے یا (اس سے مراد) شہادت کی موت ہے۔ اور یہاں اُن لوگوں سے خطاب ہے جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ آنحضور علیہ السلام کی معیت میں میدانِ جنگ میں پہنچیں اور بزرگی و کرامت کے اُس درجہ کو حاصل کریں جس پر شہدائے بدر فائز ہوئے تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے غزوۂ اُحد کے موقع پر (دشمنوں کے خلاف باہر) نکل کر لڑنے پر زور دیا تھا۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ موت کے سامنے آنے سے پہلے ہی۔

(یعنی تمہاری یہ شہادت کی تمنّا اور آرزو اُس وقت تھی) جب کہ ابھی تم نے جنگ کا مشاہدہ بھی نہیں کیا تھا اور اُس کی شدّت کو نہ پہچان پائے تھے۔ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ سو اُس کو تو کھلی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔

یعنی تم نے اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا جبکہ تمہارے سوا تمہارے بھائی بند قتل ہوئے۔ اور اس میں اُنہیں ڈانٹ دینا مقصود ہے کہ[1] اُنھوں نے جنگ کی خواہش کی تھی اور اُس کا سبب بنے تھے پھر بزدلی دکھائی اور پیچھے ہٹنے لگے۔ یا[2] اس بات پر ڈانٹ دینا مقصود ہے کہ اُنھوں نے شہادت کی تمنّا کی تھی کیونکہ شہادت کی تمنّا کرنے میں (ایک پہلو) غلبۂ کفّار کی خواہش (کا) ہے۔ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔

(آپ بھی ایک پیغمبر ہیں) لہٰذا آپ بھی (اس جہانِ فانی سے) وفات پاکر یا درجۂ شہادت پر فائز ہوکر چلے جائیں گے جیسے پہلے انبیاء علیہم السلام (اپنا فریضہ انجام دے کر) رخصت ہوگئے (نبوت منزل موت نہیں)۔ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ سو اگر آپ کا انتقال ہوجاوے یا آپ شہید ہی ہوجاویں تو کیا تم لوگ اُلٹے پھر جاؤ گے؟

یہاں استفہام سے انکار مقصود ہے کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وفات یا شہادت پاکر رحلت کر جائیں تو وہ مرتد نہ ہوں گے اور دین سے اپنی ایڑیوں کے بل مڑ نہیں جائیں گے بعد اس علم ہو جانے کے کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء گزر گئے اور اُن کا دین باقی ہے اور اُس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور بعض مفسرین

کہتے ہیں کہ (أَفَإِن مَاتَ میں) فاء سببیہ ہے اور ہمزہ انکاری ہے اور انکار (ارتداد سے نہیں بلکہ) اس بات سے ہے کہ لوگ آنحضور علیہ السلام سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے گذر جانے کو آپ کی وفات کے بعد اپنے پھر جانے کا سبب بنائیں (یعنی جب سب انبیاء فوت ہو گئے تو گویا سب دین ہی غلط ہے)

منقول ہے کہ عبد اللہ بن قَمِیئہ حارثی نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایک پتھر مارا جس سے آپ کے سامنے کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔ اُس وقت مصعب بن عُمَیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ سے (حملے کا) دفاع کر رہے تھے اور وہ صاحبِ عَلَم تھے یہاں تک کہ ابن قمیئہ نے اُنہیں شہید کر دیا اور سمجھا کہ اُس نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو شہید کر دیا ہے اُس نے (پکار کر) کہا میں نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو قتل کر دیا ہے اور ایک پکارنے والا باآوازِ بلند پکارا کہ (دیکھو) اب محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) بھی قتل کر دیے گئے۔ اس پر لوگ لوٹنے لگے اور آنحضور علیہ السلام پکار رہے تھے: "اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہ" (اللہ کے بندو میری طرف آؤ) (آپ کی آواز سُن کر) تیس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کی حفاظت کرنے لگے حتیٰ کہ اُنہوں نے مشرکین کو آپ سے دُور ہٹا دیا اور باقی منتشر ہو گئے۔ (اس نازک موقع پر) بعض مسلمانوں نے کہا: کاش عبد اللہ بن اُبَی ہمارے لیے ابوسفیان سے امان لے لیتا ــــ اور بعض منافقین نے کہا کہ "اگر آپ نبی ہوتے تو قتل نہ کیے جاتے (اے لوگو!) تم اپنے بھائیوں کی طرف (پھر جاؤ) اور اپنے (پہلے) دین کی طرف لوٹ جاؤ" یہ سُن کر اَنَس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چچا تھے کہا: "اے میری قوم! اگر محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قتل ہو گئے تو کیا ہوا! محمد

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا رب تو زندہ ہے وہ نہیں مرے گا اور (ہاں) تم آنحضور علیہ السلام (کے ساتھ محبت رکھتے تھے اپنے محبوب) کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ لہٰذا تم بھی اُسی مقصدِ عظیم) کے لیے جنگ لڑ کر جان دے دو جس کے لیے اُنہوں نے اپنی جان سپرد جان آفرین کر دی۔" پھر اُس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: یا اللہ! جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں میں اُس بارے میں تجھ سے معذرت چاہتا ہوں اور اِس معاملہ میں اپنی برأت (ظاہر) کرتا ہوں۔ پھر اُنہوں نے اپنی تلوار لے کر حملہ کیا اور لڑتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ) اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا اور جو شخص اُلٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا۔

یعنی مرتد ہو جانے سے (اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا) بلکہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا۔

وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ اور خدا تعالیٰ جلد ہی عوض دے گا حق شناس لوگوں کو۔

یعنی جو لوگ نعمتِ اسلام پر (شکر ادا کرتے ہیں یعنی اُس پر ثابت قدم رہتے ہیں جیسے حضرت انس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کی مانند لوگ اللہ تعالیٰ جلدی ہی اُنہیں اچھا بدلہ دے گا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدون حکمِ خدا تعالیٰ کے۔

(یعنی جو کوئی مرتا ہے) اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ یا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ ملک الموت علیہ السلام کو اُس کی جان قبض کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اس کا

یہ معنی ہے کہ ہر جان کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم اور فیصلے میں ایک وقت مقرر ہے۔
(اور لوگ) جو جنگ سے ڈر کر دور رہتے ہیں اور پیش قدمی نہیں کرتے وہ اپنے وقتِ مقررہ سے ایک گھڑی بھی نہ تاخیر پا سکتے ہیں نہ تقدیم۔ اور اس (آیۃ) میں قتال کے بارے میں اُبھارنا اور حوصلہ دلانا مقصود ہے اور رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حفاظت اور تاخیرِ اجل کا وعدہ ہے۔

كِتَابًا اس طور سے کہ اس کی میعاد لکھی ہوئی رہتی ہے۔

مصدر ہے جو تاکید کے لیے آئی ہے (یعنی مفعولِ مطلق ہے) اور معنی یہ ہوگا کہ موت لازمی طور پر لکھی جا چکی ہے (كُتِبَ الْمَوْتُ كِتَابًا)۔

مُؤَجَّلًا معین

یہ كِتَابًا کی صفت ہے اور اس کا معنی ہے وقتِ مقرّرہ جسے نہ بڑھایا جا سکے اور نہ گھٹایا جا سکے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا اور جو شخص دُنیوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اُسے دُنیا کا حصہ دے دیتے ہیں۔

یہ اُن مسلمانوں پر تعریض ہے جو غزوۂ اُحد میں غنیمتوں میں لگ گئے تھے۔ (ہوا یوں کہ) مسلمانوں نے مشرکین پر حملہ کیا، انہیں شکست دی اور (مالِ غنیمت) لوٹنا شروع کیا تو جب تیر اندازوں نے یہ دیکھا وہ بھی غنیمت کی طرف بڑھے اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مشرکین نے موقع غنیمت جانا اور پیچھے سے حملہ کر دیا اور (اس طرح) مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا ہوا۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا اور جو شخص اُخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اسے آخرت کا حصہ دیں گے۔

یعنی آخرت کا ثواب اور نیک بدلہ عطا کریں گے۔

وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ اور ہم بہت جلد عوض دیں گے حق شناسوں کو۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا اور کسی چیز نے انہیں جہاد سے نہ روکا۔

وَکَاَیِّنْ اور بہت سے ہو چکے ہیں۔

اس کا اصل یہ ہے کہ اَیٌّ پر کاف (جارّہ) داخل ہوا اور (یوں وہ کَمْ (خبریہ) کے معنیٰ میں ہو گیا۔ اور نون تنوین کا ہے جو لکھنے میں علیٰ غیر القیاس اس طرح ظاہر کر دیا گیا (کہ مصحفِ عثمانی میں ایسے ہی تھا) اور ابن کثیر نے اسے کَائِنْ مانند کَاعِنْ کے پڑھا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس (کَاَیِّنْ کو ایک ہی کلمہ سمجھ کر قلب (یعنی تعلیل) کی گئی ہے جس طرح اَعْمَرِیْ کو (ایک کلمہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ تین ہیں پھر اسے بول چال میں) رَعَمْلِیْ کہتے ہیں۔ تو اس طرح (قلب سے کَاَیِّنْ کو) کَیَئِّنْ بنایا تھا اب اس میں تخفیف کی خاطر یائے ثانیہ (یائے مشدّدہ میں سے دوسری یاء) کو محذوف کر دیا اور (اس طرح وہ کَیْئِنْ بن گیا اب یائے ساکن کے شروع میں فتح ہے لہٰذا) دوسری یاء کو الف میں بدل دیا (اور کَائِنْ بن گیا) بالکل اسی طرح طَائِیٌّ کی تعلیلات ہیں (۱) طَیِّئٌ سے (۲) طَیْئِیٌّ سے (۳) طَائِیٌّ بن گیا)

مِّنْ نَّبِیٍّ نبی

(مِنْ بیانیہ ہے) یہ کَاَیِّنْ کا بیان ہے۔

قٰتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ جن کے ساتھ ہو کر بہت اللہ والے لڑے ہیں۔

(رِبِّیُّوْن سے مُراد) اہل علم و تقویٰ (ہیں) یا اپنے رب کی عبادت کرنے والے اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے مراد جماعتیں ہیں۔ الربۃ بمعنی جماعت سے

اسم نسبت رِبّیؔ آیا (اور یائے نسبت) مبالغہ کے لیے (ہے) اور ابنِ کثیر نے اور نافع ابو عمرو اور یعقوب نے (قَاتَلَ کی بجائے) قُتِلَ پڑھا ہے اور (قُتِلَ کا) اِسناد رِبِّیُّوْن کی طرف ہوگا یا ضمیر نبی (معہٗ) کی طرف ہوگا۔ اور (کتنے ہی نبی ہیں جو قتل کیے گئے درآنحالیکہ میدانِ جنگ میں اُن کے ساتھ بہت سے خُداپرست موجود تھے۔) (اگر قتل کا اسناد نبیؐ کی طرف کیا جائے تو) معہٗ رِبِّیُّوْن کثیر اُس کا حال ہوگا۔ (اگر قُتِلَ کی نسبت رِبِّیُّوْنَ کی طرف کی جائے تو ربیون کثیر مفعول مالم یُسَمّ فاعلہ ہوگا) اور قتل کو بالتشدید (قُتِّلَ) بھی پڑھا گیا ہے جو صورت اول (قُتِلَ ربّیّون) کی تائید میں ہے۔ اور رِبّیون کو بنیادی طور پر رَبِّیُّوْنَ فتح (راء) سے بھی پڑھا گیا ہے اور رَاء کے ضمہ سے رُبِّیُّوْن بھی پڑھا گیا ہے اور اسم نسبت میں یہ تغیرات (اعراب) ہوتے رہتے ہیں جیسے کسر میں۔

فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ سو نہ تو ہمت ہاری اُنہوں نے اُن مصائب کی وجہ سے جو اُن پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں۔

یعنی[۱] نہ تو وہ تھکے اور نہ اُن کی کوششیں ختم ہوئیں اگرچہ اُن پر نبی کے قتل ہو جانے کی مصیبت بھی پڑی۔ یا[۲] یہ کہ اگرچہ اُن میں سے کچھ لوگ قتل ہو گئے۔

وَمَا ضَعُفُوا اور نہ اُن کا زور گھٹا۔

یعنی[۱] اُنہوں نے دشمن کے مقابلے میں کمزوری نہ دکھائی۔ یا[۲] یہ کہ اُنہوں نے دین میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا۔

وَمَا اسْتَكَانُوا اور نہ وہ دبے۔

یعنی اُنہوں نے دشمنوں کے سامنے عاجزی نہ دکھائی اور[۱] اِسْتِکَانَ (باب

افتعال) کا مادہ سکون ہے کیونکہ خاضع اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مدِ مقابل کے سامنے رُک جاتا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ جو (سلوک) چاہے کرے۔ اِس صورت میں استکانوا میں الف، اشباع کا ہوگا جو کاف کے فتح کو کھینچنے سے پیدا ہوا۔ یا یہ اصل میں استکین تھا جو مادہ کون سے بنا ہے (باب استفعال سے) معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ اپنے نفس سے ایسا ہونے کا مطالبہ کرے کہ دوسرا اُسے ذلیل کرے اور یہ تعریض ہے اُس تکلیف و مصیبت پر جو اُنہیں رسولِ پاک صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قتل کی افواہ پر پہنچی تھی۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبّت ہے۔

(اللہ تعالیٰ کی محبت کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ) پھر وہ اُن کی مدد کرتا ہے اور اُن کی قدر و منزلت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اور [illegible] بھی تو اس کے سوا [illegible] کچھ نہیں نکلا کہ انہوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور [illegible] کاموں میں ہمارے حد سے نکل جانے کو بخش دیجئے اور ہمیں ثابت قدم رکھیے اور ہمیں کافروں پر غالب کیجیے

یعنی [illegible] نے اپنی ثابت قدمی [illegible] دین [illegible] حق [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] نہ کیا [illegible] کے (کہ [illegible] اور ہماری خطائیں معاف فرما الٰہی یعنی گناہ اور اسراف کو کسر نفسی کرتے ہوئے اپنی جانوں کی طرف منسوب کیا۔ اور یہ کہ جو کچھ انہیں تکلیف پہنچی ہے اُن کی سوء اعمالی

کی وجہ سے پہنچی ہے لہذا اُس کی معافی چاہی پھر جنگ میں ثابت قدمی اور دشمن پر فتح پانے کی دُعا کی تاکہ یہ دُعا عاجزی و طہارت کے ساتھ (اللہ کی جناب میں) جلد قبولیت پائے اور قَوْلَهُمْ كَانَ کی خبر ہے اور أَنْ قَالُوا اسم کان جو بوجہ جہتِ نسبت اور زمانِ حدث پر دلالت کرنے کے "قولھم" سے زیادہ معرفہ ہے لہذا اعرف کو مبتدا رکھا گیا (کہ قاعدہ یہی ہے)

فَآتَاهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ سو اُنہیں اللہ تعالیٰ نے دُنیا کا بھی بدلہ دیا اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ (دیا) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکو کاروں سے محبت ہے۔

اُن کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے اور اُس کی طرف پناہ پکڑنے کے سبب اللہ تعالیٰ نے اُنہیں نصرت (و فتح)، (مالِ) غنیمت، عزت اور ذکرِ خیر اس دنیا میں نصیب فرمایا اور آخرت میں جنت اور نعمتیں عطا کیں اور آخرت کے ثواب کو حُسنِ ثواب سے تعبیر فرمایا اُس کی فضیلت کو محسوس کرانے کی خاطر اور یہ بھی کہ وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک لائقِ التفات ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تمہیں پھیر دیں گے۔

یعنی تمہیں کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

عَلٰى أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خَاسِرِيْنَ اُلٹا، پھر تم ناکام ہو جاؤ گے۔

شانِ نزول: ہزیمت کے وقت مسلمانوں سے منافقین نے جب کہا کہ

"اپنے (پرانے) دین پر لوٹ جاؤ اور اپنے بھائی بندوں کی طرف (ہو جاؤ) اگر محمد (علیہ السلام) نبی ہوتے تو قتل نہ ہوتے۔" اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اور[2] یہ بھی کہا گیا کہ (اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے) مراد یہ ہے کہ اگر تم ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں کے لیے عاجزی اختیار کرو گے اور اُن سے امن (و صلح) کی درخواست کرو گے تو وہ تمہیں اپنے دین کی طرف لوٹا لیں گے۔ اور[3] یہ بھی کہا گیا کہ اطاعتِ کفار سے مراد عام کفار کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ کیونکہ یہ چیز آہستہ آہستہ اُن کی موافقت کی طرف کھینچ لاتی ہے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارا دوست ہے۔

یعنی تمہارا ناصر و مُعین ہے اور اسے (بَلِ اللّٰهُ کی بجائے) منصوب (بَلِ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ) بھی پڑھا گیا ہے اس تقدیر پر کہ گویا اصل عبارت یوں تھی بَلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ۔

وَهُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔

لہٰذا تم (اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرتے ہوئے) کسی غیر کی دوستی اور امداد سے بے نیاز ہو جاؤ۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں ہَول کا فروں کے دلوں میں۔

اس سے مراد وہ خوف و دہشت ہے جو غزوۂ اُحد میں کافروں کے دلوں میں ڈال دیا تھا حتیٰ کہ وہ (میدانِ) جنگ چھوڑ کر بغیر کسی سبب کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور ابوسفیان نے پکار کر کہا کہ "اے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اب ہماری مڈبھیڑ (آئندہ سال) بدر کے مقام پر ہو گی، اگر چاہو

تو مقابلہ کر لینا۔" آپ نے فرمایا: "اگر اللہ نے چاہا۔" اور یہ بھی کہا گیا کہ جب وہ پلٹ گئے اور کچھ دور جا چکے تو شرمندہ ہوئے اور ارادہ کیا کہ واپس آکر اُن (مسلمانوں) کو مٹا ڈالیں اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ اور ابن عامر، کسائی اور یعقوب نے پورے قرآن مجید میں (الرُّعُبَ) عین کے ضمہ سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے عین کے سکون سے (الرُّعْبَ) پڑھا ہے۔

بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ بسبب اس کے کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرالیا ہے۔

"با" سببیہ ہے۔

مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ایسی چیز کو جس پر کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی۔

یعنی اور معبود بنانے اور ان کو شریک کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ تھی اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں کوئی دلیل نازل فرمائی تھی۔ جیسے شاعر نے کہا ہے

لَا يُفْزِعُ الْاَرْنَبَ اَهْوَالُهَا

وَلَا تَرَى الضَّبَّ بِهَا يَنْجَحِرْ

(ترجمہ: اُس دشت و بیابان کی ہولناکیاں خرگوش کو خوفزدہ نہیں کرتیں اور نہ تو کوئی گوہ دیکھے گا جو بِل میں گھسے (یعنی وہاں کوئی گوہ ہے ہی نہیں کہ بل میں گھسے) اسی طرح شرک کے لیے سرے سے کوئی حجت ہے ہی نہیں تو نازل کیا ہوتی) اور سلطان کا مفہوم قوت و تسلط ہے [illegible] السلیط اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی قوت بیان بہت زیادہ (اور مشتعل کردے) اور السلاطۃ زبان کی تیزی (اور جوش بیان) کے لیے آتا ہے۔

وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ اور اُن

کی جگہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے نا انصافوں کی۔

ظاہر (ظالمین) کو مضمر (ھُمْ) کی جگہ رکھا تاکہ حکم میں تحقیق بیان کی جائے اور اس حکم کا سبب بھی بیان کر دیا جائے (یعنی غیر شرعی زندگی بسر کرنے والا خواہ کوئی ہو وہ بھی مشرکین ہوں) یا اس سے قبل و بعد کے سب اس حکم کے تحت سزا پائیں گے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا۔

جو تقویٰ اور صبر سے مشروط تھا اور یہ اس وقت پورا ہو چکا تھا تاآنکہ تیر اندازوں نے حکم رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی۔ کیونکہ جب مشرکین بڑھ رہے تھے تیر انداز انہیں تیروں کا نشانہ بنا رہے تھے اور باقی (مجاہدین) تلواروں سے (مصروف) بنا دیتے اور ان کی گردنیں مار رہے تھے حتیٰ کہ وہ شکست کھا گئے اور مسلمان ان کے پیچھے پیچھے چلے۔

اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے۔

تَحُسُّوْنَهُمْ کا معنی ہوتا ہے کہ اَبْطَلَ حِسَّهٗ اس کی قوت حس کو ختم کر دیا (یعنی مار ڈالا)۔

حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ یہاں تک کہ تم بزدلی کرنے لگے۔

تم نے بزدلی دکھائی اور تمہاری رائے کمزور پڑ گئی یا یہ کہ تم غنیمت کی طرف مائل ہو گئے کیونکہ بزدلی بھی کم عقلی کی بنا پر ہوتی ہے۔

وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ اور باہم حکم میں اختلاف کرنے لگے۔

تیر اندازوں کا اختلاف مراد ہے جبکہ مشرکین شکست کھا چکے تھے لیکن

تو یوں کہا تھا: "اب ہمارا یہاں کھڑا ہونا بے فائدہ ہے۔" اور بعض نے کہا تھا کہ "ہم تو آنحضور علیہ السلام کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے۔" پس تیر اندازوں کا امیر چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا رہا جو دس سے کم تھے اور باقی سب لوٹ کی طرف بھاگ گئے۔ اور یہی معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا۔

وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تمہیں تمہاری دلخواہ بات دکھلا دی تھی۔

تمہاری پسندیدہ چیزیں (دشمن پر) کامیابی اور (مال) غنیمت اور دشمن کا شکست کھا جانا وغیرہ اور اِذَا کا جواب اِمْتَحَنَكُمْ محذوف ہے۔

مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا تم میں سے بعض تو وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے غنیمت لوٹنے کی خاطر مرکز چھوڑ دیا تھا۔

وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ اور بعض تم میں سے وہ تھے جو آخرت کے طلبگار تھے۔

ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضور علیہ السلام کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے (آخر دم تک) ڈٹے رہے۔

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ پھر تمہیں ان کفار سے ہٹا دیا۔

یعنی تمہیں اُن سے روکے رکھا حتی کہ وہ (مشرک لوگ) پلٹ کر آ گئے اور تم پر غالب آ گئے۔

لِيَبْتَلِيَكُمْ تاکہ (خدا تعالیٰ) تمہاری آزمائش فرما دے۔

مصائب میں (مبتلا کر دے) اور پھر مصائب کے بعد تمہاری ایمان پر پختگی کا امتحان لے۔

وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ اور یقین سمجھو کہ (اللہ تعالیٰ نے) تمہیں معاف کر دیا۔
تم پر مہربانی کرتے ہوئے اور اس لیے کہ اُس نے تمہاری مخالفتِ حکم پر پشیمانی کو جان لیا۔

وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں پر۔

اُن[1] سے درگزر کر کے مہربانیاں کرتے ہیں یا[2] یہ کہ تمام حالات میں (وہ اُن پر مہربان ہیں ظاہر طور پر) خواہ وہ حالات مسلمانوں کے حق میں ہوں یا اُن کے خلاف کیونکہ آزمائش و ابتلاء بھی رحمت ہے۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ (وہ وقت یاد کرو) جبکہ تم چڑھے چلے جاتے تھے۔

صَرَفَكُمْ[1] سے متعلق ہے یا[2] لِيَبْتَلِيَكُمْ سے متعلق ہے یا[3] مقدر محذوف مثل اُذْكُرُوْا وغیرہ سے متعلق ہے اور اِصعاد کا معنی چلے جانا اور زمین میں دُور نکل جانا ہے۔ کہا جاتا ہے اَصْعَدْنَا مِنْ مَكَّةَ اِلَى مَدِيْنَةَ (ہم مکہ سے مدینہ کی طرف گئے)۔

وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ اور کسی کو مڑ کر بھی تو نہ دیکھتے تھے۔

کوئی شخص دوسرے کی خاطر نہ رکتا تھا اور اُس کی انتظار نہ کرتا تھا۔

وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ اور رسول تمہیں پکار رہے تھے۔

آپ فرماتے تھے: اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ، اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ، اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ يَكِرَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ (اللہ کے بندو میری طرف آؤ میں اللہ کا رسول ہوں جو شخص پلٹ کر حملہ کرے گا اُس کا بدلہ جنت ہے۔

فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ تمہارے پیچھے کی جانب سے۔

یعنی[1] لشکر کے ساقہ (پچھلے دستے) میں یا[2] تمہاری پیچھے والی جماعت میں۔

فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ سو خدا تعالیٰ نے تمہیں پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے۔

یہ صَرَفَكُمْ پر عطف ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری کمزوری اور نافرمانی کا بدلہ ایک غم کے بعد دوسرا غم یکے بعد دیگرے دیا۔ کہ ایک تمہارا قتل ہونے کا غم، دوسرا زخمی ہونے کا غم، پھر مشرکین کی فتح کا غم اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قتل کی افواہ کا غم (یہ تمام غم گویا تمہاری اُس کمزوری اور نافرمانی کا بدلہ تھے) یا (بِغَمٍّ میں باء سببیہ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ) تمہیں غم دیا اُس غم کے بدلے میں جو تم نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نافرمانی کرکے پہنچایا تھا۔

لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا اَصَابَكُمْ تاکہ تم مغموم نہ ہوا کرو، نہ اُس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اُس پر جو تم پر مصیبت پڑے۔

(یعنی تمہیں غم پر غم اس لیے دیا کہ) تم سختیوں پر صبر کرنے کے عادی ہو جاؤ اور پھر جو کچھ نفع (حاصل ہوکر) جاتا رہے یا تکلیف و ضرر پہنچے اُس پر غم و اندوہ نہ کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ (لَا تَحْزَنُوْا اور لَا مَا اَصَابَكُمْ میں) لَا زائدہ ہے اور معنی یہ ہے تاکہ تم اُس فتح و غنیمت پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی اور اُس زخم خوردگی اور شکست کی مصیبت پر جو تمہیں سزا کے طور پر پہنچی آئی افسوس کرو۔

بعض نے آثَابَكُم (کی ضمیر واحد غائب) کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کہا ہے اور آثَابَ کا معنی آسَاكُمْ کیا ہے یعنی آنحضور علیہ السلام نے غم میں تمہارے ساتھ ہمدردی کی اور وہ بھی تم پر نازل شدہ مصیبت پر

غمزدہ ہوئے جس طرح تم اُن پہ آنے والی تکلیف سے غمگین ہوئے تھے۔ اور
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمہیں تمہاری عدول حکمی پر تمہاری تسلی
کے واسطے ملامت نہیں کی تاکہ تم فوت شدہ نصرت و فتح اور در آمدہ شکست و
مصیبت پر غم نہ کرو۔

وَاللّٰهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ اور اللہ تعالیٰ خبر رکھتے ہیں تمہارے
سب کاموں کی۔

تمہارے اعمال سے واقف ہیں اور جو کچھ تم نے قصد کیا تھا اُس سے
بھی (خبردار ہیں)۔

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا
پھر اللہ تعالیٰ نے اُس غم کے بعد تم پر چین و سکون بھیجا

یعنی اونگھ نے تمہیں آلیا اور حضرت ابی طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ میدانِ جنگ میں ہم پر اونگھ طاری ہو گئی۔ ہم میں سے کسی
کے ہاتھوں سے تلوار گر پڑتی تھی وہ اسے اٹھا لیتا تھا پھر تلوار گر پڑتی تھی اور
وہ اسے اٹھا لیتا تھا۔ اور اَمَنَة کا معنی ہے امن یہ مفعول بہ ہونے کی بنا
پر منصوب ہے اور نُعَاسًا اس سے بدل ہے یا نُعَاسًا مفعول بہ ہے اور
اَمَنَةً اس سے حال واقع ہوا ہے مقدم کر دیا گیا ہے یا اَمَنَةً مفعول لہ
ہے [illegible] نعاسا کو مفعول بہ قرار دیا [illegible] مخاطبین سے حال
واقع ہوا ہے یعنی ذوی اَمَنَةٍ یا اَمَنَةً آمن کی جمع ہے جیسے بار
کی جمع بررۃ۔ اور [illegible]
پڑھا ہے گویا وہ امن سے اسم مرہ ہے یعنی ایک بار امن نازل ہوا۔
يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ کہ تم میں سے ایک جماعت پر تو اس کا غلبہ

ہو رہا تھا۔

یعنی اُن کو اُونگھ (ڈھانپے ہوئے تھی) اور حمزہ اور کسائی نے اسے تاء کے ساتھ (تَغْشٰی) پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس کا فاعل اَمَنَۃً ہے اور طَائِفَۃً سے مراد سچے ایماندار لوگ ہیں۔

وَطَائِفَۃٌ اور ایک جماعت وہ تھی۔

یعنی منافقین۔

قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ کہ اُن کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی۔

اُن کے دلوں نے اُنہیں ہُموم میں ڈال دیا تھا یا یہ معنیٰ ہے کہ بڑی فکر جو اُن کو لگی ہوئی تھی وہ اُن کی اپنی جانیں تھیں اور یہ کہ کسی طرح وہ بچ جائیں۔

یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلافِ واقع خیالات کر رہے تھے جو کہ محض حماقت تھی۔

یہ طَائِفَۃٌ کی دوسری صفت ہے یا اُس کا حال ہے یا نیا جملہ ہے جو اپنے سے ماقبل کے بیان میں آیا ہے اور 'غیر الحق' مفعول مطلق ہو کر منصوب ہے۔ یعنی اصل عبارت یوں تھی ، یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الظَّنِّ الْحَقِّ الَّذِیْ یَحِقُّ اَنْ یُّظَنَّ بِہٖ (وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ٹھیک گمان نہیں رکھتے جو مناسب تھا کہ کیا جاتا) اور "ظَنَّ الجاھلیۃ" اُس سے بدل واقع ہوا ہے اور یہ وہ ظن ہے جو مِلّتِ جاہلیت اور اصحابِ جاہلیت سے خاص ہے۔

یَقُوْلُوْنَ وہ یوں کہہ رہے تھے۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہتے تھے اور یقولون یَظُنُّوْن سے بدل ہے۔

هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ کیا ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے ؟

یعنی کیا جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے اور (ہم سے) فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے کچھ بھی حصہ ہمارے لیے ہو سکتا ہے ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کو بنی خزرج کے قتل (و شہادت) کی خبر ملی تو اُس وقت اُس نے یہ کہا تھا اور معنیٰ یہ ہو گا کہ ہمیں اپنے متعلق تدبیر اور اپنے اختیار سے تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہے اور اب ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا یا (یوں کہا کہ) کیا ہم پر یہ زبردستی اور جبر ختم بھی ہو گا تاکہ ہمارے لیے بھی کچھ اختیار حاصل ہو ۔

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ آپ فرما دیجیے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا ہے ۔

یعنی حقیقی غلبہ (اور اختیار) اللہ ہی کے لیے ہے اور پھر (اللہ کی دین) اُس کے اولیاء کے لیے ہے کیونکہ (فرمایا) بلا شبہ اللہ کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے ۔ یا (الامر سے مُراد) قضاء (ہے کہ یہ) اُسی کے لیے ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کا چاہے فیصلہ (و حکم) دیتا ہے ۔ اور یہ جملہ معترضہ ہے اور ابوعمرو اور یعقوب نے كُلَّهٗ کو مرفوع (كُلُّهٗ) پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مبتدا ہے ۔

يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جسے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے ۔

یقولون کی ضمیر سے حال واقع ہوا ہے ۔ یعنی وہ کہتے ہیں یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ رشد و ہدایت چاہتے ہیں اور (فتح و نصرت کے طالب ہیں مگر اپنے دلوں میں انکار اور تکذیب چھپائے ہوئے ہیں ۔

يَقُوْلُوْنَ کہتے ہیں۔

یعنی اپنے دلوں میں کہتے ہیں یا جب ایک دوسرے کو خلوت میں ملتے ہیں۔ اور یہ (یقولون) یُخْفُوْنَ سے بدل واقع ہوا ہے یا نیا جملہ ہے جو اُس (یخفون) کے بیان کے لیے آیا ہے۔

لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا۔

جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا یا آپ نے یہ گمان کیا تھا کہ تمام معاملہ اللہ تعالیٰ (کے ہاتھ میں ہے) اور اولیاء اللہ کے حق میں ہے یا یہ کہ ہمارے بس میں کوئی اختیار و تدبیر ہوتی اور ہم ایسی حالت میں نہ ہوتے جس طرح کہ (مدینہ سے نہ نکلنے کے متعلق) عبد اللہ بن اُبی وغیرہ کی رائے تھی۔

مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا تو ہم یہاں مقتول نہ ہوتے۔

ہم پر غلبہ نہ پایا جاتا یا یہ کہ جو کوئی ہم میں سے اس جنگ میں قتل ہوا ہے وہ قتل نہ ہوتا۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ آپ فرمائیے کہ تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لیے قتل مقدر ہو چکا ہے وہ لوگ اُن مقامات کی طرف نکل پڑتے جہاں وہ گر رہے تھے۔

جن کا قتل ہونا اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا تھا اور لوحِ محفوظ میں لکھ دیا تھا وہ ضرور اپنے قتل ہونے کی جگہ کی طرف نکل آتے اور مدینہ میں قیام اُن کو فائدہ نہ دیتا اور اُن میں سے کوئی بھی نہ بچ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے معاملہ مقدر کر دیا تھا اور اُسے پختہ کر دیا تھا ہر صورت میں سمجھ لیا گیا تھا کوئی امر ایسے

فیصلے کو بدلنے والا نہیں۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ اور یہ (جو کچھ ہوا) اس لیے ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے۔

یعنی جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے آزمائے اور اُس کے پوشیدہ حالات یعنی خلوص و نفاق کو ظاہر کر دے اور یہ فعلِ محذوف کی علت ہے۔ یعنی وَ فَعَلَ ذَالِكَ لِيَبْتَلِيَ ...... (اور اُس نے یہ اس لیے کیا کہ آزمائے) یا محذوف پر عطف ہے۔ یا اللہ کے قول لِكَيْلَا تَحْزَنُوا پر عطف ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات کو صاف کر دے۔

اُن (کے حال) کو کھول دے اور اُن میں امتیاز پیدا کر دے یا یہ کہ اُنہیں وسوسوں سے پاک کر دے۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔

یعنی دل کی باتیں ظاہر کرنے سے پہلے ہی وہ اُن سے پوشیدہ ہوتے ہوئے بھی واقف ہے اور اس میں وعدہ (ثواب) بھی ہے اور (عذاب کی) دھمکی بھی۔ اور اس میں یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ وہ آزمائش سے بھی بے نیاز ہے۔ اور یہ تو اُس نے مسلمانوں کو مشق اور عادت میں ڈال کر پختہ اور ثابت اور منافقین کے حال کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا

تم میں سے جن لوگوں نے پُشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ اُن کو شیطان نے لغزش دے دی اُن کے بعض اعمال کے سبب ———— یعنی جو لوگ جنگِ اُحد میں شکست خوردہ ہوئے اُن کی شکست خوردگی کا سبب شیطان ہوا تھا کہ اُس نے اُنہیں پھسلا دیا تو انہوں نے اُس کی بات مان لی تھی اور غنیمت یا جان بچانے کی خواہش میں مرکز چھوڑنے میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نافرمانی کی تھی اور یہی اُن کے گناہ تھے لہٰذا اُن سے تائید (ایزدی) اور قوتِ قلب سلب کر لی گئی تھی اور یہ بھی کہا گیا کہ شیطان کے پھسلانے سے مقصد اُس کی توتی (...) تھی اور یہ اُن گناہوں کے سبب سے تھا جو پہلے اُن سے سرزد ہوئے تھے کیونکہ گناہ ایک دوسرے کو کھینچ لاتے ہیں (کہ ایک کے بعد دوسرا) جس طرح (نیکی و) فرمانبرداری (کے کام ایک دوسرے کا باعث بنتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا کہ اُس نے اُنہیں گزشتہ گناہ یاد دلا کے پھسلا دیا تھا اور اُنہوں نے خلوصِ توبہ اور گناہ سے نکلنے سے بیشتر جہاد کو ناپسند کر لیا تھا۔

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف فرما دیا۔

اُن کی توبہ اور عُذر خواہی کی وجہ سے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ واقعی اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں۔

گناہوں کو بخشنے والے ہیں۔

حَلِيْمٌ بڑے حلم والے ہیں۔

گناہ کرنے والے کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتے کہ شاید توبہ کر لے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اے ایمان والو! تم اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو کافر ہیں۔

یہاں کافروں سے مُراد منافقین ہیں۔

وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کی نسبت۔

اُن کی وجہ سے یا اُن کے متعلق اور اُخوت سے مراد اُن کا اتفاق نسب یا مذہب ہے۔

اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ جبکہ وہ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں۔

تجارت کی غرض سے یا کسی اور معاملے میں دور دراز نکل جاتے ہیں۔ اور یہاں (اِذَا کی بجائے) اِذْ ہونا چاہیے تھا (کیونکہ اِذْ ہی ماضی کے لیے آتا ہے اور) قَالُوْا کا لفظ اس پر شاہد ہے مگر اِذَا (جو مستقبل کے لیے آتا ہے) اس لیے لایا گیا کہ یہ حال کی حکایتِ ماضیہ ہے۔

اَوْ كَانُوْا غُزًّى یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں۔

یہ غازٍ کی جمع ہے جس طرح عافٍ کی جمع عُفًّى آتی ہے۔

لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔

قَالُوْا کا مفعول ہے اور یہ دلالت کرتا ہے کہ اُن کے اِخوان اُن کے مخاطب نہیں۔

لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو اُن کے قلوب میں موجبِ حسرت کر دیں۔

(لِیَجعل میں پہلا) لام لامِ عاقبت ہے اور یہ قَالُوْا سے متعلق ہے۔

اسی طرح لیکون لهم عدوًّا وَحَزَنًا (الآیۃ) میں (لام لامِ عاقبۃ ہے یعنی انجام کار ایسا ہوا گویا اُن کا مقصد ہی یہی تھا) یا لَا تکونوا سے متعلق

ہے یعنی ایسی باتیں کہنے میں اور ایسا عقیدہ رکھنے میں اُن جیسے نہ ہو جاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ اِس چیز کو خاص کر اُن کے دل میں باعثِ حسرت و افسوس بنا دے۔ اس طرح ذالك سے اشارہ اُس اعتقاد کی طرف ہوگا جس پر اُن کا قول دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذالك کا مشارٌ الیہ "لاتکونوا" کا مدلول ہے یعنی تم اُن جیسے نہ بن جاؤ تاکہ تمہارے اُن جیسے نہ بننے کو اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں باعثِ حسرت و افسوس بنا دے کیونکہ (تمہارا) اُن کے مخالف اور برعکس ہونا اُنہیں رنجیدہ خاطر کرتا ہے۔

وَ اللّٰهُ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ اور جلاتا مارتا تو اللہ ہی ہے۔

یہ اُن کے قول کا جواب ہے کہ حیات و موت میں اللہ تعالیٰ کا حکم چلتا ہے۔ اِقامت اور سفر کو اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ بسا اوقات مسافر اور (جنگجو) غازی کو زندہ رکھتا ہے اور (گھر میں) قیام رکھنے والے اور جنگ پر نہ جانے والے کو مار دیتا ہے۔

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

(خطاب کا صیغہ لایا گیا) یہ مسلمانوں کو اُن (کافروں) کی مماثلت اختیار کرنے پر زجر و توبیخ ہے۔ اور ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے لمبے یاء کے ساتھ (یَعْمَلُوْن) پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ کفر و انکار کرنے والوں کے لیے وعید (عذاب) ہے۔

وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ اور اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ۔

یعنی (اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤ یا) اُس کی راہ میں (کسی اور طرح) فوت

ہوجاؤ اور نافع، حمزہ اور کسائی نے مَاتَ یَمَاتُ سے (مِتُّمْ) میم کے کسرہ سے پڑھا ہے۔

لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا تَجْمَعُوْنَ

تو بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت اُن چیزوں سے بہتر ہے جن کو تم لوگ جمع کر رہے ہو۔

(ولئن قتلتم میں لام قسمیہ گزرا ہے اور) یہ (اُس) قسم کا جواب ہے اور یہ جزا کے قائم مقام آیا ہے۔ معنٰی یہ ہوگا کہ سفر اور جنگ جوئی اُن امور میں سے نہیں جو موت کو کھینچ لائیں اور مقررّہ وقت کو مقدّم کر دیں اور اگر یہ بھی ہو تو اللہ کی راہ میں ہے پھر جو تم ایسی موت سے مغفرت اور رحمت پاؤ گے وہ (بدرجہا) اُس مال و منال سے بہتر ہے جو تم زندہ رہ کر دُنیا اور اُس کے فوائد و منافع اکٹھے کرو گے۔ اور حفص نے اسے یا سے (یَجْمَعُوْن) پڑھا ہے۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ اور اگر تم مرگئے یا مارے گئے

یعنی جس طور پر بھی تمہاری موت واقع ہو۔

لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ. تو بالضرور اللہ ہی کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔

جس کی طرف تم قصد کرو گے اور اپنی جانیں اُس کی رضا کی خاطر خرچ کرو گے کسی اور کی طرف تمہیں جمع نہیں کیا جائے گا پھر وہ تمہیں پورا پورا بدلا دے گا اور تمہارا ثواب بڑھا دے گا۔ اور (یہاں بھی) نافع، حمزہ اور کسائی نے مِتُّمْ بالکسرہ پڑھا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ بعد اِس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ اُن کے ساتھ نرم رہے۔

یعنی رحمت کے ساتھ۔ اور یہاں (بِمَا میں) مَا زائدہ ہے جو تاکید اور تنبیہ کے لیے لایا گیا ہے اور یہ دلالت کرتا ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی نرمی اللہ کی رحمت ہی ہے۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا اور اگر آپ تُند خُو۔

بُرے (اور تنگ) اخلاق والے اور سختی (و جفا) کرنے والے۔

غَلِيظَ الْقَلْبِ سخت طبیعت ہوتے

جس کے دل میں قساوت (و سختی) ہو۔

لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔

اور آپ کے پاس اکٹھے نہ ہوتے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ سو آپ اِنہیں معاف کر دیجیے۔

ایسی باتوں میں درگزر فرمائیے جو آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اور ان کے لیے استغفار کر دیجیے۔

ایسے امور میں جو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور اِن سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔

یعنی جنگ کے بارے میں یا ایسے معاملات میں مشورہ لیجیے جن میں مشورہ لینا مناسب ہے اس سے ان کی رائے بھی معلوم ہو جائے گی (اور مناسب طریق سے اُس پر عمل کیا جا سکے گا) اور اُن کے دل بھی خوش ہو جائیں گے اور آئندہ یہ چیز اُمّت کے لیے سنّتِ مشاورت کی تمہید ثابت ہو گی۔

فَإِذَا عَزَمْتَ پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں۔

یعنی (لوگوں سے) مشورہ کے بعد آپ جب اپنے دل میں ایک فیصلہ کر چکیں۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجیے۔

پھر اپنے معاملے میں اس طریق پر عمل کرتے ہوئے جو آپ کو زیادہ قرینِ مصلحت معلوم ہو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجیے کیونکہ حقیقت کو تو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور فَاِذَا عَزَمْتَ کو صیغہ متکلّم (عَزَمْتُ) بھی پڑھا گیا ہے (اس طرح یہ قول اپنے متعلق ہوگا اور) معنٰی یہ ہوگا کہ جب میں تمہارے لیے کسی بات کا پختہ ارادہ کرلوں اور اسے تمہارے لیے مقرر (و واضح) کردوں تو پھر مجھی پر بھروسہ کرو اور اُس کے بارے میں کسی سے مشورہ مت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

لہٰذا اُن کی امداد کرتے ہیں اور بھلائی کی طرف اُن کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں۔

جس طرح غزوۂ بدر میں تمہارا ساتھ دیا۔

فَلَا غَالِبَ لَكُمْ تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا

یعنی کوئی بھی تم پر غلبہ نہیں پا سکتا۔

وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں۔

جس طرح غزوۂ اُحد میں تمہیں ہزیمت اُٹھانا پڑی۔

فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ تو اُس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے (اور غالب کردے)

اُس[1] کے ساتھ نہ دینے کے بعد (کوئی تمہاری امداد نہیں کرسکتا) یا[2] یہ کہ اللہ کے بعد کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتا) مطلب یہ کہ تم نے اُس (کے احکام) سے تجاوز کیا لہٰذا تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا اور یہ توکّل کے تقاضا کے لیے خبردار

کرنا اور اُس بات پر اُبھارنا مقصود ہے جو ذلت و رسوائی کے کھینچ لانے کا سبب بنتی ہیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے

لہذا توکّل صرف اُسی ذات پر ہی کرنا چاہیے جبکہ اُنھوں نے یہ جان لیا ہے کہ اُس کے سوا اُن کا کوئی مددگار نہیں اور وہ اُس پر ایمان بھی لا چکے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ غنیمتوں وغیرہ میں، کیونکہ نبوت خیانت کے مُنافی ہے۔ کہا جاتا ہے غَلَّ شَيْئًا مِنَ الْمَغْنَمِ (اُس نے غنیمت میں سے کچھ چھپا لیا) يَغُلُّ غُلُولًا اور (باب افعال سے) اَغَلَّ (مصدر) اِغْلَالًا۔ (یہ اُس وقت کہا جاتا ہے) جب کوئی شخص خفیہ طور پر کوئی چیز لے لے۔

شانِ نزول: اس[1] سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اُس اتّہام سے بَری ثابت کرنا مقصود ہے جو آپ پر لگایا گیا تھا جیسا کہ روایت ہے کہ غزوہ بدر میں ایک سُرخ چادر گم ہو گئی تو بعض منافقین نے کہا کہ شاید رسول پاک علیہ السلام نے اُسے اپنے لیے رکھ لیا ہو گا یا[2] جو غزوہ اُحد میں تیر اندازوں نے گمان کیا تھا اور اُنھوں نے غنیمت لوٹنے کے لیے مرکز چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے (اپنے میں) یہ کہا تھا کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ (نہ) کہہ دیں کہ جس نے جو چیز لُوٹی ہے وہ اُسی کی ہے اور آپ غنیمتیں تقسیم ہی نہ کریں۔" یا[2] رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہی کرنے کو نفی سے تعبیر کیا گویا آنحضور علیہ السلام کو مبالغہ کرتے ہوئے روکا گیا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ آپ نے چند دستے (کہیں دشمن کے خلاف) روانہ کیے پھر (اُن کے

جلنے کے بعد) مالِ غنیمت حاصل ہوا تو آپ نے اپنے ساتھ (موجود) لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اُن دستوں کے لیے کچھ حصہ باقی نہ رکھا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی" اس صورت میں بعض مستحق لوگوں کو محروم کر دینے کو (سختی اور) تشدید کی غرض سے غُلول سے تعبیر کیا (ورنہ یہ خیانت نہ تھی) اور دوسرا مبالغہ مقصود ہوگا یعنی ایک عام بات کو مبالغہ کر کے خیانت سے تعبیر کیا۔ اور نافع، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے اسے صیغہ مجہول (أَنْ يُغَلَّ) پڑھا ہے اور معنٰی (اس صورت میں) یوں ہوگا کہ یہ بات صحیح نہیں کہ (کوئی) نبی غُلول کرنے والا پایا جائے یا یہ کہ اُسے خیانت کی طرف نسبت دی جائے۔

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حالانکہ جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا۔

[1] جو چیز خیانت کی ہوگی اُسے اپنی گردن پر اُٹھائے ہوئے لائے گا جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ یا [2] جو چیز خیانت کی تھی اُس کا وبال اور گناہ اُٹھا لائے گا۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر شخص کو اُس کے کیے کا پورا عوض ملے گا۔

یعنی جو کچھ اُس نے کمایا تھا اُس کی پوری پوری جزا دی جائے گی۔ اور ماقبل کے مناسب یہ تھا کہ کہا جاتا: ثُمَّ يُوَفّٰى مَا كَسَبَ (یعنی پہلے صیغہ مذکر چل رہا تھا اب بھی مذکر ہی کا صیغہ لایا جاتا) تو وجہ یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ نے) یہاں حکم کو عام کر دیا ہے۔ ایک تو اس سے مقصود یہ دلیل دینا تھی (کہ جب ہر ایک کو جزا و سزا ملے گی تو خائن کو بھی ملے گی) اور دوسرا اس سے مبالغہ مقصود ہے کہ جب دوسرے مجرموں کو سزا ملے گی تو خیانت ایک بڑا جرم ہے اس کے مرتکب

کرنا اور اُس بات پر اُبھارنا مقصود ہے جو ذلّت و رسوائی کے کھینچ لانے کا سبب بنتی ہیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے

لہذا توکّل صرف اُسی ذات پر ہی کرنا چاہیے جبکہ اُنھوں نے یہ جان لیا ہے کہ اُس کے سوا اُن کا کوئی مددگار نہیں اور وہ اُس پر ایمان بھی لا چکے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ غنیمتوں وغیرہ میں، کیونکہ نبوت خیانت کے منافی ہے۔ کہا جاتا ہے غَلَّ شَيْئًا مِنَ الْمَغْنَم (اُس نے غنیمت میں سے کچھ چھپا لیا) يَغُلُّ غُلُوْلًا اور (باب افعال سے) اَغَلَّ (مصدر) اِغْلَالًا۔ (یہ اُس وقت کہا جاتا ہے) جب کوئی شخص خفیہ طور پر کوئی چیز لے لے۔

شانِ نزول: اس سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اُس اتہام سے بری ثابت کرنا مقصود ہے جو آپ پر لگایا گیا تھا جیسا کہ روایت ہے کہ غزوۂ بدر میں ایک سُرخ چادر گم ہو گئی تو بعض منافقین نے کہا کہ شاید رسول پاک علیہ السلام نے اُسے اپنے لیے رکھ لیا ہو گا یا جو غزوہ اُحد میں تیر اندازوں نے گمان کیا تھا اور اُنھوں نے غنیمت لوٹنے کے لیے مرکز چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے (اپنے میں) یہ کہا تھا کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں آنحضور علیہ الصلوۃ والسلام یہ (نہ) کہہ دیں کہ جس نے جو چیز لوٹی ہے وہ اُسی کی ہے اور آپ غنیمتیں تقسیم ہی نہ کریں۔" یا رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہی کرنے کو نفی سے تعبیر کیا گو یا آنحضور علیہ السلام کو مبالغہ کرتے ہوئے روکا گیا جیسا کہ روایت ہے کہ آپ نے چند دستے (کہیں دشمن کے خلاف) روانہ کیے پھر (اُن کے

جلنے کے بعد) مالِ غنیمت حاصل ہوا تو آپ نے اپنے ساتھ (موجود) لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اُن دستوں کے لیے کچھ حصہ باقی نہ رکھا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس صورت میں بعض مستحق لوگوں کو محروم کر دینے کو (سختی اور) تشدید کی غرض سے غُلول سے تعبیر کیا (ورنہ یہ خیانت نہ تھی) اور دوسرا مبالغہ مقصود ہوگا یعنی ایک عام بات کو مبالغہ کر کے خیانت سے تعبیر کیا۔ اور نافع، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے اسے صیغہ مجہول (أَنْ يُغَلَّ) پڑھا ہے اور معنی (اس صورت میں) یوں ہوگا کہ یہ بات صحیح نہیں کہ (کوئی) نبی غلول کرنے والا پایا جائے یا یہ کہ اُسے خیانت کی طرف نسبت دی جائے۔

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حالانکہ جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا۔

جو چیز خیانت کی ہوگی اُسے اپنی گردن پر اُٹھائے ہوئے لائے گا جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ یا جو چیز خیانت کی تھی اُس کا وبال اور گناہ اُٹھا لائے گا۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر شخص کو اُس کے کیے کا پورا عوض ملے گا۔

یعنی جو کچھ اُس نے کمایا تھا اُس کی پوری پوری جزاء دی جائے گی۔ اور ماقبل کے مناسب یہ تھا کہ کہا جاتا: ثُمَّ يُوَفّٰى مَا كَسَبَ (یعنی پہلے صیغہ مذکر چلا رہا تھا اب بھی مذکر ہی کا صیغہ لایا جاتا) تو وجہ یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ نے) یہاں حکم کو عام کر دیا ہے۔ ایک تو اس سے مقصود یہ دلیل دینا تھی (کہ جب ہر ایک کو جزاء سزا ملے گی تو خائن کو بھی ملے گی) اور دوسرا اس سے مبالغہ مقصود ہے کہ جب دوسرے مجرموں کو سزا ملے گی تو خیانت ایک بڑا جرم ہے اس کے مرتکب

کو تو بالاؤلیٰ سزا ملے گی۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ اور اُن پر بالکل ظلم نہ ہوگا۔

اُن میں سے کسی فرمانبردار کا ثواب کم نہ کیا جائے گا اور کسی نافرمان کی سزا زیادہ نہیں کی جائے گی۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ سو ایسا شخص جو رضائے حق کا تابع ہو اور طاعت گزار ہو۔

كَمَنْ بَاءَ کیا وہ اُس شخص کے مثل ہو جائے گا جو مستحق ہو۔

بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ غضبِ الٰہی کا۔

(اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا) بسبب نافرمانیوں کے۔

وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہو اور وہ جانے کی بُری جگہ ہے۔

مَصیر اور مَرجع میں یہ فرق ہے کہ مصیر میں ضروری ہے کہ وہ پہلی حالت سے مختلف ہو اور مَرجع میں ایسا ضروری نہیں اور جہنم بدترین جگہ ہوگی سب سے مختلف۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللَّهِ یہ (مذکورین) درجات میں مختلف ہوں گے اللہ کے نزدیک۔

اُنہیں درجات سے تشبیہ (استعارہ) کیا کیونکہ ثواب اور عذاب کے لحاظ سے اُن میں (ایسے ہی) فرق ہوگا (جس طرح سیڑھی کے درجوں میں اوپر نیچے وغیرہ) یا (اس کا معنی یہ ہے کہ) وہ درجوں والے ہوں گے۔ (ذَوُو درجات)

وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں اُن کے اعمال کو۔

اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال اور درجاتِ اعمال سے جو اُن سے صادر ہوتے ہیں خوب واقف ہیں لہٰذا اُن کے مطابق اُن کو بدلہ دیں گے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا۔

(وہ مسلمان) جو آپ کی قوم میں سے آپ پر ایمان لائے تھے اُن پر انعام فرمایا اور خاص کر کے اُن پر احسان اس لیے بتلایا کہ اُنھوں نے اس نعمت سے زیادہ فائدہ اُٹھایا ورنہ آپ کی بعثت تو عام ہے (آپ رحمۃ للعالمین ہیں) اور لِسے لَمِنْ مَّنِّ اللّٰہِ بھی پڑھا گیا ہے جبکہ اسے مبتدا محذوف کی خبر قرار دیا جائے اور مبتدا محذوف مَنُّہٗ یا بَعْثُہٗ ہوگا۔

اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ جبکہ اُن میں اُنھی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا۔

یعنی اُن کے خاندان (قریش) میں سے یا اُن کی جنس و قوم (عرب) میں سے (بھیجا) تاکہ وہ آنحضور (علیہ السلام) کے کلام کو سہولت سے سمجھ سکیں اور آپ کے حالات از قبیلِ صدق و امانت وغیرہ سے واقف ہوں اور آپ کی وجہ سے (دوسروں پر فخر کر سکیں اور بعض قرّاء نے اسے مِنْ اَنْفَسِهِمْ (بفتح الفاء) پڑھا ہے یعنی آپ اُن میں سے شریف ترین ہیں کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قبائلِ عرب اور نیچے کی پشتوں میں بھی بلند تر قبیلے اور شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ کہ وہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔

یعنی قرآن پاک۔ بعد اس کے کہ وہ جاہل لوگ تھے اور وحی (کا نام بھی) نہ

سن پلے تھے۔
وَيُزَكِّيهِمْ اور اُن لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں۔
یعنی (ظاہری) طبائع کا میل کچیل بھی دُور کرتے ہیں اور (باطنی برائی) بداعتقادی اور بدعملی کا گرد بھی صاف کرتے ہیں۔
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اور اُن کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔
یعنی قرآن پاک اور سنتِ کریمہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)
وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے۔
یہاں اِن مخفف من مثقلہ ہے (یعنی اِنَّ سے تخفیف کرکے اِن پڑھا گیا) اور لَفِي ضَلٰلٍ میں لام فارقہ (کہ اِنْ (نافیہ) وصلیہ نہیں بلکہ مخففہ من الثقلیہ ہے یہی بتلانے کے لیے) ہے اور معنٰی یہ ہوگا: "اور حال یہ تھا کہ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے" {اِنْ كَانُوا = اِنَّهُمْ كَانُوا = (ضمیر شان محذوف ہوئی نون کو خفیف کیا لہذا) اِنْ كَانُوا ہوا۔}
أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا اور جب تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دو حصے تم جیت چکے تھے تو کیا (ایسے وقت میں) تم (یوں) کہتے ہو کہ یہ کدھر سے ہوئی۔
(ہمزہ استفہام کا نہیں بلکہ تنبیہ کرنے اور (مفہوم مابعد کو) ثابت کرنے کے لیے ہے اور واؤ عاطفہ ہے (عطف القصہ علی القصہ یعنی) اس جملے کا عطف اُن واقعات پر ہے جو اُحد کے بارے میں ذکر ہوئے (یعنی فرمایا تھا وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم الخ یہ اُسی پر عطف ہے) یا محذوف

پر عطف ہے (جو ہمزہ کے بعد اور واؤ سے پہلے محذوف ہے) عبارت تقدیری یوں تھی اَفَعَلْتُمْ کَذَا وَ قُلْتُمْ..... الخ لَمَّا، قُلْتُمْ کا ظرف ہے جس کی نسبت اَصَابَتْکُمْ کی طرف ہے یعنی تم نے یہ کہا جب تم پر مصیبت آ پڑی، وہ یہ کہ غزوہ اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے جبکہ تم غزوہ بدر میں اُس سے دُگنا پا چکے تھے۔ یعنی دشمن کے ستر آدمی قتل اور ستر ہی قیدی بنائے تھے" (پھر تم یہ کہتے ہو کہ) یہ مصیبت کہاں سے آئی۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں (فتح و) نصرت کا وعدہ دیا تھا۔

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ آپ فرما دیجیے کہ (یہ بلا) خاص تمہاری طرف سے ہوئی۔

یعنی یہ مصیبت اس وجہ سے ہے جس کا خود تمہاری ذوات نے ارتکاب کیا کہ آنحضور علیہ السلام کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے مرکز کو چھوڑ بیٹھے اور وعدہ نصرت تو ثابت قدمی اور اطاعت سے مشروط تھا یا اس وجہ سے کہ تم نے ہی مدینہ سے نکل کر مقابلہ کرنے کو کہا تھا اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس وجہ سے کہ تم نے غزوہ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا تھا (اب اس کا نتیجہ تمہیں یہاں نقصان اٹھانا پڑا)۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

جب وہ ہر بات پر قادر ہے تو وہ امداد دینے اور امداد روک لینے پر بھی قادر ہے اور اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمہیں شکست دلائے۔۔ اور تمہیں فتح دینے پر بھی قادر ہے۔

وَمَا اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اور جو مصیبت تم پر

پڑی جس روز کہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے۔

ایک جماعت مسلمانوں کی اور دوسری جماعت مشرکین کی تھی۔ مراد غزوۂ اُحد ہے۔

فَبِإِذْنِ اللّٰهِ سو خدا تعالیٰ کی مشیت سے ہوئی۔

یہ[1] بات اللہ تعالیٰ کی قضاء (اور فیصلے) میں ایسے ہی تھی یا[2] کفار کے کھلا چھوڑ دینے کو اِذن سے تعبیر کیا کیونکہ تخلیہ (کھلا چھوڑ دینا) بھی لوازم اِذن میں سے ہے۔

وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا اور تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین کو بھی دیکھ لیں اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنھوں نے نفاق کا برتاؤ کیا۔

تاکہ مومنین اور منافقین میں خطِ امتیاز قائم ہو جائے اُن کا ایمان ظاہر ہو جائے اور اِن کا کفر و نفاق۔

وَقِيلَ لَهُمْ اور اُن سے (یوں) کہا گیا۔

نَافَقُوا پر معطوف ہے اور الّذین کا صلہ (ثانیہ) ہے۔ یا[2] یہ جملہ کلمہ ہے (اس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں)۔

تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوِ ادْفَعُوا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑنا یا دشمنوں کا دفعیہ بن جانا۔

اس معاملے میں اُنھیں تقسیم بتا دی اور اختیار دے دیا کہ (چاہو تو) آخرت کی جزاء کے لیے جہاد کرو یا (کم از کم) اپنے جان و مال سے مدافعت (اور اُس کی حفاظت) کے لیے ہی جنگ میں حصہ لو۔ اور کہا گیا کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کافروں سے لڑو یا مجاہدین کے لشکر کو بڑھا کر اُن کا دفاع کرو کیونکہ لشکر

کی زیادتی دشمن کو مرعوب کرتی ہے اور اُن کی طاقت کو توڑتی ہے۔

قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ وہ بولے کہ اگر ہم کوئی ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔

اگر ہم جانتے کہ اسے صحیح معنی میں قتال کا نام دیا جا سکتا ہے تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے مگر یہ معاملہ جس میں تم ہو قتال نہیں کہلا سکتا بلکہ یہ تو اپنے آپ کو صریح ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یا یہ کہ ہمیں جنگ کرنا صحیح معنی میں آتا ہی نہیں، نہیں تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے اور یہ بدنیتی اور مذاق کی خاطر کہا۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ

یہ (منافقین) اس روز کفر سے نزدیک تر ہو گئے بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ ایمان سے نزدیک تھے۔

اُن کے (جنگ سے) پیچھے ہٹ جانے اور ایسی باتیں کرنے کے سبب سے کیونکہ یہ دونوں چیزیں (قول و فعل) بھلی علامات تھیں جس نے اُن کے کفر سے آگاہ کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ جب اُن سے یہ باتیں صادر ہوئیں تو وہ گویا اہلِ کفر کی امداد کے زیادہ قریب تھے بہ نسبت اہلِ ایمان کے کیونکہ اُن کا پیچھے ہٹنا اور ایسی باتیں کہنا مشرکین کے لیے تقویت کا باعث تھا اور اہلِ ایمان کو باعثِ خذلان ـــــ (دوسری صورت میں لِلْكُفْرِ سے لِاَهْلِ الْكُفْرِ اور لِلْاِيْمَانِ سے لِاَهْلِ الْاِيْمَانِ مُراد لیں گے)

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں۔

وہ جو کچھ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اُس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں اور ایمان کے متعلق اُن کے دل اُن کی زبانوں کی موافقت نہیں کرتے اور قول کا اِسناد

آفْوَاہ (مُونھوں) سے کیا (حالانکہ باتیں تو منہ سے ہی کی جاتی ہیں تو وجہ یہ ہے) کہ اس سے تاکید اور خاکہ کشی (محاکاۃ) مقصود ہے۔

وَاللّٰہُ أَعْلَمُ بِمَا یَکْتُمُوْنَ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

یعنی نفاق اور تنہائی میں جو ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی واقف ہے) کیونکہ وہ تو سب کچھ علمِ واجب کے ساتھ (بغیر کسی کی اعانت کے) تفصیلی طور پر جانتا ہے اور تم (صرف) اجمالاً (اور وہ بھی) علامات سے جان سکتے ہو۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا یہ ایسے لوگ ہیں کہ باتیں بناتے ہیں۔

یکتمون کی (واؤ یعنی) ضمیر جمع غائب سے بدل ہو کر مرفوع ہے [۲] یا بنا بر مذمت منصوب ہے (یعنی اَذُمُّ فعل کا مفعول ہے جو ہمیشہ مقدر مانا جاتا ہے) [۳] یا الذین نافقوا کا وصف ہے [لہٰذا اُسی کا سا اعراب (نصب) ہوگا] [۴] یا افواھھم کی ضمیرِ مجرور سے بدل ہو کر مجرور ہے۔ [۵] یا قلوبھم کی ضمیر مجرور سے بدل ہو کر مجرور ہے۔ جیسے ایک شاعر نے کہا ؎

عَلٰی حَالَۃٍ لَوْ اَنَّ فِی الْقَوْمِ حَاتِمًا
عَلٰی جُوْدِہٖ لَضَنَّ بِالْمَاءِ حَاتِمٖ

(ایک ایسی حالت میں کہ اگر قوم میں حاتم بھی موجود ہوتا تو باوجود فیاضی اور سخاوت میں مشہور ہونے کے حاتم بھی پانی کے بارے میں بخل سے کام لیتا)۔ (یہاں مقامِ استدلال یہ ہے کہ قافیہ حاتم مجرور ہے جو اسم ظاہر ہونے کے باوجود جُودہٖ کی ضمیر مجرور سے بدل واقع ہونے پر مجرور ہو گیا)۔

لِاِخْوَانِہِمْ اپنے بھائیوں کی نسبت۔

یعنی اُن کی خاطر کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اُن کے اقارب میں سے غزوہ اُحد میں شہید ہوئے۔ یا اُن کے متعلق جو اُن کے بھائی بند (نہ قریبی رشتے دار) شہید ہوئے۔

وَقَعَدُوْا بیٹھے ہوئے۔

حال ہے، اس سے پہلے قَدْ مقدّر ہے یعنی اُنھوں نے یہ کہا جبکہ وہ جنگ میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔

لَوْ أَطَاعُوْنَا کہ اگر ہمارا کہنا مانتے۔

اور مدینہ میں بیٹھے رہتے۔

مَا قُتِلُوْا تو قتل نہ کیے جاتے۔

جیسے ہم قتل نہ ہوئے وہ بھی قتل نہ ہوتے اور بچ جاتے۔ اور ہشام نے اسے (مَا قُتِّلُوْا) تا کی تشدید سے پڑھا ہے (یعنی اس طرح سختی سے قتل نہ کیے جاتے)

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ آپ فرما دیجیے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم سچے ہو۔

یعنی اگر تم (اپنے دعوی میں) سچے ہو کہ تم موت کو (اُس شخص سے) دُور کر سکتے ہو (جس پر موت یا قتل ہونا لکھا گیا ہے) تو پھر اپنی جانوں کو ہی موت اور اُس کے اسباب سے بچا لو کیونکہ تم اس کے زیادہ لائق ہو۔ اور مطلب یہ ہے کہ (جنگ سے) بیٹھ رہنا موت سے بچانے والا نہیں کیونکہ موت کے اسباب بہت زیادہ ہیں۔ جس طرح قتال موت کا اور (گھر میں) بیٹھ رہنا نجات کا سبب بن سکتا ہے بالکل اسی طرح معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے (کہ جو

جنگ میں گیا ہو وہ بچ جائے اور گھر میں بیٹھ رہنے والے کو موت آلے)۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا

اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے اُن کو مُردہ مت خیال کرو۔

شانِ نزول: شہدائے اُحد کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شہدائے بدر کے متعلق نازل ہوئی اور خطاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے یا ہر شخص کے لیے (جو پڑھے یا سنے) اور اسے یا کے ساتھ (وَلَا يَحْسَبَنَّ) بھی پڑھا گیا ہے اِس صورت میں ضمیر کا اسناد حضور علیہ السلام کی طرف ہوگا یا (ضمیرِ غائب کا مرجع عام ہوگا کہ) جو شخص گمان کرتا ہو یا اَلَّذِيْن قُتِلُوْا کی طرف اس ضمیر کا مرجع ہے (یعنی اَلَّذِيْن قُتِلُوْا اس کا فاعل ہوگا۔) اور (حَسِبَ افعالِ قلوب میں سے ہے جس کے دو مفعول آتے ہیں جب اَلَّذِيْن قُتِلُوْا فاعل ہوا تو) مفعول اوّل (اَنْفُسَهُمْ وغیرہ) محذوف ہوگا کیونکہ نحوی قاعدہ ہے کہ جب قرینہ موجود ہو تو مفعولِ اوّل کا حذف جائز ہوتا ہے اور ابن عامر نے (اَلَّذِيْن قُتِلُوْا کو) باب تفعیل سے قُتِّلُوْا پڑھا ہے جو کثرتِ مقتولین پر دلالت کرتا ہے۔

بَلْ اَحْيَآءٌ بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔

مبتدا محذوف ہے یعنی هُمْ اَحْيَآءٌ اور اسے منصوب بھی پڑھا گیا اس بنا پر کہ اَحْسَبُهُمْ محذوف مقدر ہے اور یہ اُس کا مفعول ثانی ہے۔

عِنْدَ رَبِّهِمْ اپنے پروردگار کے مقرّب ہیں۔

يُرْزَقُوْنَ اُنہیں رزق بھی ملتا ہے۔

یعنی جنّت سے (اُنہیں رزق دیا جاتا ہے) اور یہ اس بات کی پختگی پر دالّ ہے کہ وہ واقعۃً زندہ ہیں، (صرف شہرت وغیرہ کی بنیاد پر نہیں)۔

فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وہ خوش ہیں اس چیز سے جو اُنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی۔

(مِنْ فَضْلِہٖ بیان ہے مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ کا) اور وہ ہے شرفِ شہادت اور ہمیشہ کی زندگی پانے میں کامیابی اور اللہ تعالیٰ کا قرب اور جنت کی نعمتوں سے مُتمتّع ہونا۔

وَیَسْتَبْشِرُوْنَ اور وہ خوش ہوتے ہیں بشارت پاکر۔

بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ اُن لوگوں کی اس حالت پر جو اُن کے پاس نہیں پہنچے۔

یعنی اُن کے مومنین بھائی جو ابھی درجۂ شہادت پاکر اُن سے مل نہیں سکے۔

مِّنْ خَلْفِھِمْ اُن سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

یعنی جو زمانے یا درجے کے لحاظ سے اُن سے پیچھے ہیں۔

اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ یہ کہ اُن پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہونگے۔

الذین لم یلحقوا سے بدلِ (اشتمال) ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ خوش ہیں اس لحاظ سے کہ آخرت کا معاملہ اُن پر کھل چکا اور اُن لوگوں کا معاملہ بھی جنہیں اُنہوں نے اہلِ ایمان میں سے اپنے بعد چھوڑا ہے اور وہ یوں کہ جب وہ فوت ہوں گے یا شہادت پائیں گے تو ایسی زندگی پائیں گے جسے کسی چیز کے ہونے اور کسی محبوب چیز کے کھو جانے کا خوف مکدّر نہیں کرے گا۔ اور یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ انسان اس محسوس ڈھانچے کو چھوڑ کر کچھ اور چیز ہے بلکہ وہ ایک جوہر ہے جو اپنی ذات میں ادراک رکھتا ہے اور وہ بدن کے خراب ہو جانے سے فنا نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس (جسم) کے ساتھ اُس کا ادراک اور

اُس کا رنجیدہ ہونا اور اُس کا لذّت حاصل کرنا موقوف (و منحصر) ہے اور اس بات کی تائید آلِ فرعون کے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے: اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا {اُن (آل فرعون) کو صبح و شام آگ دکھائی جاتی ہے۔} (معلوم ہوا اُن کی رُوح زندہ ہے جسے آگ سے دُکھ دیا جاتا ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "اَرْوَاحُ الشُّھَدَاءِ فِیْ اَجْوَافِ طَیْرٍ خُضْرٍ تَرِدُ اَنْھَارَ الْجَنَّۃِ وَ تَاْکُلُ مِنْ ثِمَارِھَا وَ تَاْوِیْ اِلٰی قَنَادِیْلَ مُعَلَّقَۃٍ فِیْ ظِلِّ الْعَرْشِ" (شہداء کی رُوحیں سبز رنگ کے پرندوں کی صورت میں جنّت کی نہروں پر آتی ہیں جنت کے پھل کھاتی ہیں اور پھر عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلوں میں آرام پاتی ہیں) اور جن لوگوں (معتزلہ وغیرہ) نے اس بات کا انکار کیا اور کہا کہ رُوح تو ایک قسم کی ہوا اور عَرَض ہی ہے (کہ جسم کے ساتھ وہ بھی فنا ہو جاتی ہے) اُنھوں نے (اِس آیت کی تفسیر میں یُوں) کہا کہ وہ (شہداء) قیامت کے دن زندگی پائیں گے اور اسے صیغہ حال سے تعبیر کیا گیا کیونکہ (مستقبل میں) اُن کا زندہ ہونا متیقّن الوقوع اور ناگزیر ہے اور اُس کے قرب کی وجہ سے یا وہ ذکرِ (خیر) کی وجہ سے زندہ ہیں (کہ اپنی یاد باقی چھوڑ گئے) یا اپنے ایمان کی وجہ سے (گویا وہ) زندگی پا گئے ـــــ اور اس آیت میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور شہادت (کے حصول) کا شوق دلایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت میں زیادہ ہونے پر اُبھارا گیا ہے اور اُن لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے بھائیوں کے لیے اُسی طرح کے انعامات کی تمنا رکھتے ہیں جو اُن پر ہوئے اور مؤمنین کو فلاح (و نجات) کا مژدہ سنایا گیا ہے۔

یَسْتَبْشِرُوْنَ وہ خوش ہوتے ہیں۔

اسے تاکید کی خاطر دوبارہ لائے ہیں اور اس لیے بھی کہ جو چیز اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ سے متعلق (و مربوط) تھی اُسے بیان کر دیا جائے (اس صورت میں بشارت کا سبب ایک ہی تھا بخلاف صورتِ آئندہ کے جس میں دونوں بشارتیں مختلف متعلقات رکھتی ہیں وہ یہ کہ) ہو سکتا ہے پہلی بشارت اور خوشی اُن کی بھائیوں کے حال کے بارے میں ہو اور اِس جگہ اُن کی اپنی ذوات مُراد ہوں۔

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ بوجہ نعمتِ خداوندی کے۔

یعنی اپنے اعمال کے بدلے میں۔

وَفَضْلٍ اور (بوجہ) فضلِ (الٰہی) کے۔

یعنی اُن کے اجر و ثواب سے زیادہ عطا کریں گے جیسے کہ فرمایا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ (جن لوگوں نے نیکی کی اُنھیں نیکی ملے گی بلکہ اس کے علاوہ بھی بڑا ثواب) اور نِعْمَةٍ اور فَضْلٍ دونوں نکرہ لائے گئے اُن کی عظمت بتلانے کی خاطر (تنکیر للتعظیم)۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور بوجہ اس کے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔

یہ بھی منجملہ اُنہی باتوں کے ہے جن سے وہ خوشی و مَسرّت پا رہے ہیں اور اس کا عطف فَضْلٍ پر ہے۔ اور کسائی نے کسر کے ساتھ اِنَّ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ جملۂ مستأنفہ معترضہ ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ جو کچھ اُنہیں ملا ہے اُن کے ایمان کے صلے میں ملا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کے پاس (سرمایۂ) ایمان نہیں اُس کے اعمال اکارت جائیں گے اور اُس کا اجر و ثواب ضائع ہو گا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَا

أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو قبول کرلیا بعد اس کے کہ اُن کو زخم لگا تھا۔

(گزشتہ آیت میں) المؤمنین موصوف اور یہ جملہ اُس کی صفت ہے (لہٰذا مجرور ہے) یا منصوب علی المدح ہے (کہ شروع میں امدح) فعل مقدر ماننا پڑے گا) یا مبتدا (مرفوع) ہے اور اس کی خبر (آگے آتی) ہے۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ اُن لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں اُن کے لیے ثوابِ عظیم ہے۔

(اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے والے) تمام (ایمانداروں) کے لیے اجرِ عظیم ہے اور (یہاں مِنْهُمْ میں) مِنْ بیانیہ ہے (یعنی وہ حُسنِ اعمال اور شرعی احتیاط کی زندگی بسر کرتے ہیں) اور اُن کے دو وصف بیان فرمائے ایک تو اُن کی مدح کی خاطر اور دوسرا (اجرِ عظیم کی) علّت (و سبب بیان کرنے) کی خاطر، (یہ دو وصف اُن کی) تقیید و حصر کے لیے نہیں (بیان کیے) کیونکہ دعوت قبول کرنے والے (اور لبّیک کہنے والے) (الذین استجابوا) سب کے سب محسنین و متّقین ہیں۔

شانِ نزول: روایت ہے کہ جب ابوسفیان اور اُس کے ساتھی واپس ہو گئے اور (مقام) رَوْحَا پہنچے تو پشیمان ہوئے اور واپس لوٹنے (اور حملہ کرنے) کا ارادہ کیا۔ حضور علیہ السلام کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو اُن لوگوں کے تعاقب کی دعوت دی اور یہ بھی فرما دیا کہ ہمارے ساتھ صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو کل ہمارے ساتھ شریکِ جنگ تھے۔ پس آپ ایک جماعت لے کر نکلے اور 'حمراء الاسد' تک جا پہنچے جو مدینہ منوّرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ باوجودیکہ آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ

علیہم اجمعین زخموں (کی وجہ) سے (تکلیف میں) تھے تاہم اُنھوں نے اپنی جانوں پر بوجھ ڈالا تاکہ اُن سے (جہاد کا) اجر کھو نہ جائے مگر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دلوں میں رُعب ڈال دیا اور وہ چلے گئے اُس وقت یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔
اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ یہ ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا۔

یعنی[۱] بنی عبد قیس کا وہ قافلہ جو اُن (مسلمانوں) کو راستے میں ملے تھے۔ یا[۲] نُعَیم بن مسعود اشجعی مراد ہے اور (بصورتِ ثانی) شخصِ واحد کے لیے النّاس کی تاویل یہ ہوگی کہ وہ بھی ان کی جنس میں سے تھا جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے حالانکہ وہ ایک گھوڑے پر ہی سوار ہوتا ہے یا[۳] یہ کہ نُعَیم اشجعی اکیلا مُراد نہیں بلکہ وہ سب لوگ جو اُس نے اپنے ساتھ اہلِ مدینہ میں سے ملا لیے تھے اور افواہیں پھیلانے میں اپنے ساتھ شریک کر لیے تھے۔

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ کہ ان لوگوں نے تمہارے لیے سامان جمع کیا ہے سو تمہیں اُن سے اندیشہ کرنا چاہیے۔

یہاں النّاس سے مُراد ابوسفیان اور اُس کے ساتھی ہیں۔ روایت ہے کہ جب وہ اُحد سے واپس ہونے لگا تو پکار کر کہا: "اے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اب ہمارا مقابلہ آیندہ بدر کے میلے کے دِنوں ہوگا بشرطیکہ آپ مقابلہ کرنا چاہیں۔" آپ نے جواب دیا: "اِنشاء اللہ (ضرور مقابلہ ہوگا)" (اِنْ شِئْتَ کے جواب میں انشاء اللہ کہہ کر گویا تصحیح بھی فرما دی اور چیلنج بھی قبول فرما لیا) پھر جب موقع آیا تو ابوسفیان مکّہ والوں کو لے کر نکلا اور مرّ الظہران میں آکر پڑاؤ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے دل میں رعب ڈال دیا اور اُس نے واپسی

کی ٹھان لی۔ اسی[1] موقع پر بنی عبد قیس کا ایک قافلہ اُس کے پاس سے گزرا جو مدینہ سے اناج خریدنے جا رہا تھا۔ ابوسفیان نے اُنھیں ایک اونٹ کا بوجھ کشمش دینے کا وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو جا کر روک دیں۔ اور[2] یہ بھی کہا گیا کہ ابوسفیان کی ملاقات نُعیم بن مسعود سے ہوئی جو عُمرہ کرنے مکہ آیا تھا۔ ابوسفیان نے اُس سے بات کی اور اُسے دس اونٹ دینے کا وعدہ کیا تو نُعیم روانہ ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ مسلمان تیاری کر رہے ہیں، اُس نے اُن سے کہا کہ وہ لوگ تمہارے گھروں میں (تمہارے دیس میں جنگ لڑنے) آئے تھے تو تم میں سے کوئی نہ بچ سکا تھا سوائے اُن کے جو بھاگ گئے تھے، اب کیا تم یہ مناسب سمجھتے ہو کہ اُن کے مقابلے کے لیے نکلو جبکہ اُنہوں نے ایک جمعیت اکٹھی کر لی ہے۔ اس پر مسلمان سُست پڑنے لگے۔ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تو ضرور (جہاد کے لیے) نکلوں گا خواہ میرے ساتھ کوئی بھی نہ نکلے۔ پھر آپ ستّر سواروں کے ہمراہ روانہ ہوئے اور وہ کہہ رہے تھے حَسْبُنَا اللّٰه ...... الخ

فَزَادَهُمْ إِيمَانًا سو اس نے اُن کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا۔

زاد کی ضمیرِ مستتر اُس[1] قول کے لیے ہے جو اُن سے کہا گیا تھا (یعنی انّ الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم) یا[2] قال کے مصدر کی جانب راجع ہے (یعنی اس کہنے نے ایمان بڑھا دیا) یا[3] اس کا فاعل وہی ہے جو قال کا فاعل ہے بشرطیکہ اس سے صرف نُعیم مراد لیا جائے اور ضمیر بارز (ھُمْ) سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں یہ بات کہی گئی تھی (یعنی مسلمان) اور معنیٰ یہ ہو گا کہ اُنہوں نے اُس (کے پراپیگنڈے) کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نہ کمزوری دکھائی بلکہ اس سے اُن کا یقین اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور پختہ ہو گیا اور اُن کا ایمان بڑھ گیا۔ اُنہوں نے حمیتِ اسلام کا مظاہرہ کیا اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی نیّت کو

خالص کر لیا۔ اور یہ (آیت) دلیل ہے اس بات کی کہ ایمان بڑھتا اور گھٹتا ہے۔
اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول اس کی مزید تقویت کرتا ہے، آپ نے کہا: اے پیغمبرِ خدا! کیا ایمان بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "ہاں بڑھتا ہے حتیٰ کہ اہلِ ایمان جنّت میں چلا جاتا ہے اور گھٹتا بھی ہے حتیٰ کہ وہ شخص دوزخ میں پہنچ جاتا ہے۔" اگر طاعت و فرمانبرداری کو منجملہ ایمان کے شمار کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہے اور اگر طاعت کو ایمان کا حصہ قرار نہ دیا جائے تو اس صورت میں یہاں ہم کہیں گے کہ یقین بڑھتا ہے عادت کی وجہ سے اور کثرتِ غور و فکر کی وجہ سے اور کئی دلائل کے باہم مل جانے کی وجہ سے۔

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ اور (انہوں نے) کہہ دیا کہ ہمیں حق تعالیٰ کافی ہے۔
{حَسْب مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے (مُحْسِبٌ)} یعنی ہمیں کفایت کرتا ہے۔ یہ اَحْسَبَہٗ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے وہ اسے کافی ہے۔
اس میں دلیل یہ ہے کہ یہاں حَسب مصدر بمعنی صیغہ صفت ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حسب مضاف کیا جائے اپنے مابعد کی طرف تو اس کے اندر کوئی تعریف پیدا نہیں ہوتی جیسے کہا جاتا ہے ھٰذا رجلٌ حَسْبُكَ (یہ شخص تجھے کافی ہے)۔

وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لیے اچھا ہے۔
اور وہ اچھا ہے جس کی طرف معاملہ سپرد کیا جائے۔

فَانْقَلَبُوْا پس یہ لوگ واپس آئے۔

(بدر سے)

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ خدا کی نعمت کے ساتھ۔
(نعمت کا معنیٰ ہے) عافیت کے ساتھ اور ایمان پر پختگی اور اس میں اضافے کے ساتھ۔

وَفَضْلٍ اور فضل کے ساتھ۔

یعنی تجارت میں نفع کے ساتھ۔ اس لیے کہ جب یہ لوگ بدر پہنچے وہاں اُنہوں نے میلہ پایا چنانچہ اُنہوں نے وہاں تجارت کی اور فائدہ اُٹھایا۔

لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوٓءٌ اُنہیں کوئی ناگواری ذرا پیش نہیں آئی۔

یعنی (اُنہیں) کوئی زخم وغیرہ (بھی نہیں پہنچا) اور نہ دُشمن کی چالیں (اُنہیں نقصان پہنچا سکیں)۔

وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ اور وہ لوگ رضائے حق کے تابع رہے۔

اللہ کی رضا جو کامیابی کا مدار ہے دونوں عالموں کی بھلائی کے ساتھ اپنی جُرأت اور اللہ کی راہ میں نکلنے کے سبب۔

وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ اور اللہ تعالیٰ بڑا فضل والا ہے۔

اُس نے اُن پر فضل فرمایا کہ ثابت قدم رکھا، ایمان میں برکت عطا کی، جہاد کی طرف سبقت کی توفیق دی، دین میں مضبوطی عطا کی، دشمن کے خلاف جرأت کی توفیق دی اور ہر بُرائی سے اُن کی حفاظت کی اور (آخرت میں) اَجر کی ضمانت کے ساتھ اُنہیں نفع بھی پہنچایا حتیٰ کہ وہ اللہ کی نعمت اور مہربانی حاصل کر کے واپس ہوئے۔ اور اس آیت میں جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے حسرت دلانا مقصود ہے اور اُنہیں غلطی جتلانا مقصود ہے کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو اُس چیز سے محروم رکھا جسے اِن خوش نصیبوں نے حاصل کیا۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ یہ شیطان ہے۔

شیطان سے مراد جہاد سے روکنے والا نُعیم اشجعی ہے[۱] یا[۲] ابوسفیان مُراد ہے اور الشیطان، ذالکم کی خبر ہے اور اس کا مابعد یُخَوِّفُ اولیاءہ

اُس کی شیطنت کا بیان ہے یا [۲] الشیطان ، ذالکم کی صفت ہے (یہ صفت موصوف مرکب توصیفی مبتدا ہے اور) مابعد اُس کی خبر ہے اور [۳] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذالکم کا اشارہ قولِ شیطان کی طرف ہو یعنی مضاف محذوف ہو۔ اصل عبارت یہ ہے اِنّمَا ذالکم قَولُ الشیطان یعنی ابلیس علیہ اللعنۃ کا قول ہے۔

يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ کہ اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

(اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضور علیہ السلام کے ساتھ جہاد کے لیے نہیں نکلے اور مدینہ میں بیٹھے رہے۔ یا [۲] یہ کہ (مفعول اوّل مقدر ماننا پڑے گا یعنی یخوّفکم اولیاءہٗ اس صورت میں) اولیاء سے مراد ابوسفیان اور اُس کے ساتھی ہوں گے۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ سو تم اُن سے مت ڈرنا۔

(مخاطب مسلمان ہیں) ضمیر منصوب ھُمْ پہلی صورت میں (جو اوپر ذکر ہوئی) النّاس ثانی کی طرف راجع ہے (یعنی اِنّ النّاس قد جمعوا لکم اور اس سے مُراد ابوسفیان اور اُس کے ساتھی ہیں) اور بصورتِ دوم (جبکہ اولیاء سے مُراد ابوسفیان وغیرہ ہوں تو) یہ ضمیر اَولیاء کی طرف ہی راجع ہو گی۔

وَخَافُونِ اور مجھ ہی سے ڈرنا۔

یعنی میرے حکم کی مخالفت میں (مجھ سے ڈرو) لہٰذا تمہیں مناسب ہوگا کہ میرے پیغمبر کے ساتھ ہو کر دشمنوں سے لڑو۔

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم ایمان والے ہو۔

کیونکہ ایمان تقاضا کرتا ہے کہ اللہ کے خوف کو انسان کے خوف پر ترجیح دی جائے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ اور آپ کے لیے وہ لوگ موجبِ غم نہ ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں۔

اور یہ[1] منافقین تھے جو جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے یا وہ[2] لوگ جو اسلام سے پھر گئے تھے۔ اور معنی یہ ہے کہ اُن سے ضرر کا خوف آپ کو مغموم نہ کرے کہ وہ آپ کے خلاف دشمنوں کی امداد کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ

اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ذرّہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔

یعنی وہ اللہ کے دوستوں کو باوجود اپنی کافرانہ حرکات میں تیزگامی کے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ وہ تو اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور شَيْئًا مفعول بہ بھی ہو سکتا ہے اور[2] (مصدر یعنی) مفعول مطلق بھی جبکہ اسے ضَرَرًا کے معنی میں لیا جائے۔ اور نافع نے پورے قرآن پاک میں جہاں بھی آیا ہے اِسے (باب افعال سے) يُحْزِنُ پڑھا ہے سوائے سورۃ انبیاء کے (کہ وہاں اس نے بھی ثلاثی مجرّد سے) يَحْزُنُهُمُ الفزع الاكبر پڑھا ہے۔ اور باقی قرّاء نے ہر جگہ اسی طرح (ثلاثی مجرد سے) پڑھا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ آخرت میں سے اُن کو اصلاً حصہ نہ دے۔

یعنی آخرت میں ثواب کا کوئی حصہ (نہ ملے) اور اس میں دلیل ہے کہ وہ سرکشی میں انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور کفر پر مریں گے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے (يريد الله) تو اس سے یہ جتانا مقصود ہے کہ اُن کا کفر حد درجہ کو پہنچ گیا حتی کہ ارحم الراحمین (سب مہربانوں سے بڑے مہربان) نے بھی

یہی ارادہ کر لیا کہ (آخرت میں) اُس کی رحمت سے اُن کے لیے کوئی حصہ نہ ہو۔ اور اُن کا کفر میں تیزی سے بڑھنا بھی اسی لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ آخرت میں اُن کا کوئی (اجر و ثواب کا) حصہ ہو۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور اُن لوگوں کو سزائے عظیم ہوگی۔

یعنی ثواب سے محرومی کے ساتھ ساتھ (بڑی سزا بھی اُنہیں ملے گی)۔

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ یقیناً جتنے لوگوں نے ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ذرّہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اُن کو دردناک سزا ہوگی۔

تاکید[1] کی خاطر دوبارہ لایا گیا ہے (کیونکہ پہلے بھی لن یضروا اللہ گزرا ہے) یا[2] جنگ سے پیچھے رہ جانے والے منافقین یا مرتدینِ عرب کی تخصیص کے بعد یہاں تمام کافروں کے لیے مطلقاً فرمایا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ ہمارا اُن کو مہلت دینا اُن کے لیے بہتر ہے۔

حضور[1] علیہ الصلوۃ والسلام کو خطاب ہے یا[2] ہر اُس شخص کو جو گمان کرے۔

اور[1] الذین کفروا مفعول بہ ہے اور أنّما نُملی لَهُمْ اُس سے بدل ہے اور یہاں ایک ہی مفعول پر اکتفا، کیا گیا (جبکہ حسب از قبیل افعالِ قلوب ہے کہ دو مفعول چاہتا ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں سارا بھروسہ بدل پر ہے جو دو مفعولوں کا قائم مقام بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ فرمایا اَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ (یہاں اکثرھم کا بدل یسمعون ہے)۔

۲ یا مفعول اول الذین کفروا اور مفعول ثانی مضاف محذوف مقدر مانیں گے تقدیر عبارت یوں ہوگی (۱) لَا تحسبنّ الذین کفروا اصحاب أنّ الإملاء خیر لأنفسهم [أنّما = أنّ + مَا (مصدریہ)] یا (ii) یوں تقدیر عبارت ہوگی لَا تحسبنّ حَالَ الّذین کفروا أنّ الإملاء خیر لأنفسهم اور أَنّما میں مَا مصدریّہ ہے لہذا مناسب یہ تھا کہ اسے (أنّ سے ملا کر نہ لکھا جاتا بلکہ) الگ لکھا جاتا (کیونکہ مَا کافّہ مُلغی عن العمل إنّ کے ساتھ ملا کر لکھی جاتی ہے اور مَا مصدریہ الگ مگر یہاں) اس لیے (ملا کر لکھی گئی) کہ مُصحفِ عثمانی میں ملا کر لکھی ہوئی پائی گئی لہذا اُس کا اِتباع کیا گیا۔

۳ اور ابن کثیر، ابوعمرو، عاصم، کسائی اور یعقوب نے (لَا تَحْسَبَنَّ کو بصیغہ مذکر غائب) لَا یَحْسَبَنَّ پڑھا ہے اس بنا پر الّذین کفروا فاعل ہے اور أَنَّ اپنے ساتھ والوں سمیت مفعول ہے اور ابن عامر، حمزہ اور عاصم نے پورے قرآن مجید میں فتحہ سین سے (یعنی باب سمِع یسمَع) سے پڑھا ہے اور (i) إملاء کا معنیٰ ہے مُہلت دینا اور عمر کو طویل کرنا اور (ii) یہ بھی کہا گیا کہ اس کا معنیٰ ہے "اُنہیں اُن کی حالت پر چھوڑ دیا" عرب کہتے ہیں أَمْلَی لِفَرَسِہٖ جب کوئی شخص اپنے گھوڑے کی رسی کو ڈھیلا چھوڑ دے تاکہ وہ جیسے چاہے چرتا رہے۔

إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا ہم اُنہیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں تاکہ جُرم میں اُنہیں اور ترقی ہو جاوے۔

یہ نیا جملہ ہے جو حکمِ ماقبل کی علّت (وسبب) کا حامل ہے اور مَا کافّہ ہے اور (لیزدادوا میں) لام لامِ ارادہ ہے (یعنی یہ لوگ اتنے گناہ گار ہیں کہ اللہ کا ارادہ بھی اُنہیں گناہ میں بڑھانے کا ہو گیا ہے) معتزلہ کے نزدیک لام لامِ عاقبت ہے (یعنی انجام کار ایسا ہوا ــــــ جیسے "فالتقطہ آلُ

فرعون لِیکُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا" میں بھی لامِ عاقبت ہے کہ انجام کار حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کے دشمن ہونا تھے۔)

اور یہاں (اِنّما کو بالفتحہ) أنّما اور سابقہ أنّما کو (بالکسر) إنّما اور لاَتَحْسَبَنَّ کو بصیغہ غائب لاَیَحْسَبَنَ بھی پڑھا گیا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کافر یہ گمان نہ کریں ہمارا مہلت دینا اس لیے ہے کہ وہ زیادہ گناہ کریں بلکہ اس لیے ہے کہ وہ توبہ کریں اور ایمان میں داخل ہوں اور "إنّما نُملی لَهُمْ خَیْرٌ لأنفسهم" جملہ معترضہ ہے کہ کافر متنبہ ہو کر تلافیٔ مافات کرلیں۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ اور اُن کو توہین آمیز سزا ہوگی۔

یعنی اِن اعمال کے بدلے میں اُنہیں یہ سزا ملے گی) یہ جملہ لیزدادوا کی ضمیر (هُمْ) سے حال واقع ہوا ہے یعنی حَالَ کَوْنِ العَذَابِ المهین مُعَدًّا لَهُم (وہ گناہوں میں بڑھتے رہیں اس حال میں کہ رسوا کُن عذاب اُن کے لیے تیار ہوچکا ہے)۔

مَا کَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت میں نہیں رکھنا چاہتے جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے متمیّز نہ فرمادیں۔

یہ خطاب عام ہے تمام مخلص مسلمانوں اور منافقین کو جو آپ کے عہد مبارک میں تھے اور معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں ملا جلا نہیں چھوڑے گا کہ مخلص کو منافق سے الگ نہ پہچانا جاسکے یہانتک کہ اپنے پیغمبر کی طرف تمہارے احوال کے متعلق وحی کرکے منافق کو (مؤمن) مخلص سے الگ کر دے گا۔ یا یہ کہ (مُسلم معاشرے کو)

لیسے اعمال کا مکلّف قرار دے کہ اُن اعمال پر صرف مخلص ہی صبر (و پابندی) کر سکیں (وہ اعمال کیا ہوں گے؟) یہ کہ مال اور جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہوگا تاکہ حضور اکرم علیہ السلام تمہاری مخفی باتوں کو جانچ لیں اور اُن کے ذریعے تمہارے عقائد پر آگاہ ہو سکیں ــــ اور حمزہ اور کسائی نے یہاں تو حَتّٰی یَمِیْزَ پڑھا ہے اور سورۂ انفال میں یاء کی پیش، میم کی زبر اور یاء (ثانی) کو مکسور مشدّد پڑھا ہے (یعنی یُمَیِّزَ) اور باقی قراء نے (ہر جگہ فتحہ یاء، بکسرِ میم اور سکونِ یاءِ ثانیہ سے (یَمِیْزَ یعنی ثلاثی مجرّد سے ہی) پڑھا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۤءُ اور اللہ تعالیٰ ایسے اُمورِ غیبیہ پر تمہیں مُطّلع نہیں کرتے ولیکن ہاں جسے خود چاہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اُنہیں منتخب فرما لیتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کو علمِ غیب نہیں دیتا کہ تم دلوں کے کفر و ایمان پر آگاہ ہو جاؤ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی رسالت کے لیے جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے پھر اُس کی طرف وحی کرتا ہے اور بعض غیب کی باتیں بتا دیتا ہے یا کچھ علامات دیتا ہے جس سے وہ راہنمائی پا سکیں۔ {اللہ کا علم ذاتی اور غیر مُکتسَب ہوتا ہے نبی کا مُکتسَب من اللہ، اللہ کا علم کلّی ہوتا ہے پیغمبر کا جزئی اور پیغمبر تمام مغیبات کا عالم نہیں ہوتا}۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ پس اب اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ۔

صفتِ اخلاص سے متصف ہو کر ایمان لاؤ یا یہ کہ تم صرف اللہ کو ہی

غیب پر مُطّلع سمجھو اور یہ یقین کر لو کہ وہ (پیغمبر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں وہ کچھ نہیں جانتے سوا اُس کے جو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بتایا اور وہ کچھ نہیں کہتے مگر وہ باتیں جو اللہ نے اُن کی طرف وحی کیں۔

شانِ نزول: ۱- منقول ہے کہ کافروں نے کہا کہ اگر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سچے ہیں تو ہمیں بتائیں کہ ہم میں سے کون ایماندار ہے اور کون کافر اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۲- اور سدیؒ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "مجھ پر میری اُمّت پیش کی گئی اور مجھے معلوم کرایا گیا کہ کون مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور کون نہیں۔" اس پر منافقین نے کہا کہ آپ کو گمان ہے کہ آپ پہچانتے ہیں اپنے پر ایمان رکھنے والے کو بھی اور نہ ماننے والے کو بھی حالانکہ ہم اُن کے ساتھ رہتے ہیں اور آپ ہمیں نہیں پہچانتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَإِنْ تُؤْمِنُوا اور اگر تم ایمان لے آؤ۔

جیسے ایمان لانے کا حق ہے۔

وَتَتَّقُوا اور پرہیز رکھو۔

نفاق سے بچتے رہو۔

فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ تو پھر تمہیں اجرِ عظیم ملے۔

(اتنا کہ) اُس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ اور ہرگز خیال نہ کریں ایسے لوگ جو ایسی چیزیں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات کچھ اُن کے لیے اچھی ہو گی۔

اس میں بھی پہلے کی طرح قرأتیں ہیں (یعنی لا یحسبنّ ، تحسبنّ وغیرھما) اور جس نے تا سے پڑھا ہے اُس نے مضاف مقدر کیا ہے تاکہ دو مفعول ایک دوسرے پر محمول ہوں (کیونکہ یحسب کے مفعولین دراصل مبتدا اور خبر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر محمول ہوتے ہیں اور صادق آتے ہیں) تقدیر عبارت یوں ہوگی: وَلَا تَحْسَبَنَّ بُخْلَ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ هُوَخَیْرًا لَّهُمْ۔ اور اسی طرح جس نے یا سے پڑھا ہے اُس میں مضاف مقدر نکالا جائے گا اگر فاعلِ ضمیرِ رسول ہو یا ہر وہ شخص جو گمان کرے اور اگر (اسم موصول) الّذین فاعل ہو تو مفعول اول محذوف ہوگا جس پر یبخلون دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: وَلَا یَحْسَبَنَّ الْبُخَلَاءُ بُخْلَهُمْ هُوَخَیْرًا لَّهُمْ۔

بَلْ هُوَ۔ بلکہ یہ بات۔

یعنی بخل۔

شَرٌّ لَّهُمْ اُن کے لیے بہت ہی بُری ہے۔

کیونکہ یہ بخل ہی اُن کی طرف عذاب کھینچ لائے گا۔

سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنا دیے جائیں گے اُس کا جس میں اُنھوں نے بخل کیا تھا۔

یہ شَرٌّ لَّهُمْ کا بیان ہے اور معنٰی یہ ہے کہ اُن سے اس بخل کا وبال اس طرح چپک جائے گا جس طرح (گلے کا) طوق اور آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: مَامِنْ رَجُلٍ لَا یُؤَدِّیْ زَکٰوۃَ مَالِهٖ اِلَّا جَعَلَهُ اللّٰهُ شُجَاعًا فِیْ عُنُقِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ [جو شخص بھی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا قیامت کے دن وہ مال اُس کے گلے میں ایک ناگ بن کر لپٹ جائے گا۔

وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اخیر میں آسمان و زمین

اللہ تعالیٰ ہی کا رہ جاوے گا۔

یعنی جو چیز آسمان و زمین میں اس قبیل سے ہے کہ اُس کا وارث بنا جاتا ہے اُس کا فی الواقع وارث اللہ ہی ہو گا۔ تو پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اُسی کے سامنے اُس کے مال کے بارے میں بخل کرتے ہیں اور اُس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جس چیز کو وہ روکے رکھتے ہیں اور اُس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُسے برباد کر دے گا۔ اور اُن کے لیے حسرت، تاوان اور عقوبت و سزا باقی رہے گی۔

وَاللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اُن کے سب اعمال کی۔

یعنی جو کچھ وہ روکے رکھتے ہیں اور جو کچھ دیتے ہیں۔

خَبِیْرٌ پوری خبر رکھتے ہیں۔

(اور چونکہ خبردار ہیں) لہٰذا اُنہیں اُس کا بدلہ دیں گے اور نافع، ابن عامر، عاصم، حمزہ اور کسائی نے بنا بر التفات تامہ سے (تَعْمَلُوْنَ) پڑھا ہے اور یہ وعید عذاب میں زیادہ بلیغ ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لیا ہے اُن لوگوں کا قول جنہوں نے (یعنی) کہا کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں۔

یہود نے جب آیت کریمہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا سنی تو انہوں نے یہ کہا (کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں)۔

شانِ نزول: روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک خط دے کر یہود بنی قینقاع کی طرف بھیجا جس میں دعوتِ اسلام تھی اور پھر پابندی نماز، ادائیگی زکوٰۃ

اور اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسن دینے کے متعلق لکھا تھا تو فنحاص بن عاز وراء نے کہا: اللہ فقیر ہے جو اُس نے قرض مانگا ہے۔ اس پر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا اور فرمایا کہ "اگر ہمارے تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن اُڑا دیتا۔" اُس نے آنحضور علیہ السلام سے اس بات کی شکایت کی اور اُس بات سے جو کہی تھی انکار کر دیا۔ اِس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ اُس پر یہ بات مخفی نہیں اور یہ کہ اُس نے اُن کے لیے ایسی باتوں پر عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

ہم اُن کے کہے ہوئے کو لکھ رہے ہیں اور اُن کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی۔

یعنی ہم اُسے لکھنے والے فرشتوں کے صحائف میں لکھ لیتے ہیں یا یہ کہ ہم اُسے اپنے علم میں محفوظ کر لیتے ہیں اُسے یونہی نہیں چھوڑ دیتے کیونکہ یہ بہت بڑی بات ہے اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے اور قرآن پاک اور رسولِ پاک علیہ السلام کا استہزاء ہے۔ اور (یہ بات اتنی بڑی تھی کہ) اُسے قتلِ انبیاء کے ساتھ رکھا ہے اور اس میں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ یہ کوئی پہلا جُرم نہیں جس کا اُنہوں نے ارتکاب کیا اور یہ کہ جو لوگ قتلِ انبیاء تک کی جرأت کر سکتے ہیں اُن سے ایسی باتیں کہاں بعید ہیں۔ اور حمزہ نے سَيُكْتَبُ (واحد غائب مجہول) پڑھا ہے اور قَتْلَهُم کو مرفوع رکھا ہے اور اس کا مابعد وَيَقُولُ (واحد مذکر غائب) پڑھا ہے (یعنی مَا قَالُوا اور قتلھم کو نائب الفاعل گردانا ہے)۔

وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ اور ہم کہیں گے چکھو

آگ کا عذاب۔

یعنی اُن سے اس طرح انتقام لیں گے کہ اُن سے کہیں گے کہ جلانے والا عذاب چکھو اور اس میں وعیدِ عذاب میں مبالغے ہیں اور "ذَوْق" کھانے کی چیز چکھنے کے بارے میں آتا ہے اور مجازاً تمام محسوسات اور حالات کے ادراک کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں اُسے اس لیے ذکر کیا گیا کہ عذاب اُن کی اس بات ("اِنَّ اللّٰه فقیر") پر مرتب ہوا جو بخل سے پیدا ہوئی تھی اور اُنھوں نے مال کے بارے میں جان کی بازی لگا دی تھی اور انسان کی مال کے بارے میں غالب حاجت کھانے کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور بخل زیادہ تر اس لیے کرتا ہے کہ وہ ختم نہ ہو جائے اس لیے کھانے کا ذکر مال کے ساتھ اکثر آتا ہے۔

ذٰلِكَ یہ (عذاب وغیرہ)

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ اُن (اعمال) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں۔

یعنی تم نے جو (اعمال کیے از قبیلِ) قتلِ انبیاء اور جو کچھ ایسی باتیں کیں۔ یا سب گناہ مُراد ہیں اور اَنفس کی بجائے اَیدی کے لفظ سے تعبیر کیا کیونکہ اعمال اکثر ہاتھوں سے ہی انجام پاتے ہیں۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اور یہ (امر ثابت ہی ہے) کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں۔

مَا قَدَّمَتْ پر عطف ہے (اور بارِ جارّہ اس پر بھی داخل ہے) اور یہ عذاب کا سبب اس لیے ہے کہ ظلم کی نفی عدل کو مستلزم ہے اور عدل نیکی کرنے والے کو ثواب اور برائی کرنے والے کو عذاب دینے کا متقاضی ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا وہ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں۔

اور ان کہنے والوں سے مُراد کعب بن اشرف، مالک، حُیَیؒ، فنحاص اور وہب بن یہودا ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا تھا۔

یعنی تورات میں اس بات کی وصیت کی ہے۔

اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ کہ ہم کسی پیغمبر پر اعتقاد نہ لاویں جب تک کہ ہمارے سامنے (معجزہ) نذر (و نیاز خداوندی کا) ظاہر نہ کرے کہ اُسے آگ کھا جاوے۔

ہم نہ مانیں کسی رسول کو جب تک وہ یہ خاص معجزہ نہ دکھلائے جو انبیائے بنی اسرائیل کا تھا اور وہ یوں تھا کہ قربانی کی جاتی پھر نبی اُٹھتا اور دُعا کرتا آسمانی آگ اُترتی اور اُسے کھا جاتی یعنی اُسے جلا کر اپنی طبع میں بدل دیتی اور یہ اُن کی من گھڑت اور جھوٹ باتوں میں سے تھا کیونکہ آگ کا قربانی کو کھا جانا ایمان کو واجب نہیں کرتا ہاں ایک معجزہ ضرور تھا (مگر خاص یہی معجزہ باقی معجزات کو چھوڑ کر موجباتِ صداقت نبوت سے نہیں) اور معجزہ ہونے کے لحاظ سے تو سب معجزات برابر ہیں۔

قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ آپ فرما دیجیے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سے دلائل لے کر آئے اور (خود) یہ (معجزہ) بھی جس کو تم کہہ رہے ہو سو تم نے اُنہیں کیوں قتل کیا تھا اگر تم سچے ہو۔

اُن (کفار) کو جھٹلانا مقصود ہے اور اُنہیں الزام دینا مقصود ہے کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء مثل زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے تشریف لائے اُن

کے پاس اور معجزات بھی تھے جو تصدیق کو واجب کرتے تھے اور وہ معجزات بھی تھے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے انہوں نے اُنہیں بھی قتل کر دیا۔ پھر اگر وہی معجزہ دکھانا ہی تصدیق کے لیے ضروری تھا اور ان کا ایمان سے رُکنا اور توقف اُسی (کے نہ ہونے) کی وجہ سے تھا تو پھر انہیں کیا ہوا کہ یہ اُس نبی پر بھی ایمان نہ لائے جو اور معجزات کے ساتھ ان کے مطلوبہ معجزے کا حامل بھی تھا اور انہوں نے (کیوں) اُس کے قتل پر جرأت کی۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَٰبِ الْمُنِيرِ سو اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں تکذیب کی جا چکی ہے جو معجزات لے کر آئے تھے اور صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر۔

اپنی قوم اور یہود کے جھٹلانے کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلّی دینا مقصود ہے اور زُبُر جمع ہے زَبور کی اور زبور اُس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حکمتیں ہی حکمتیں ہوں۔ کسی چیز کو جب بند کر دیا جائے تو اُس وقت کہتے ہیں زَبَرْتُ الشَّيْءَ اور الکتاب عُرفِ قرآن میں اُس چیز کو کہتے ہیں جس میں اصول و احکام بیان کیے گئے ہوں (اور حکمت اور چیز ہے اور اصول و احکام اور چیز) لہذا پورے قرآن مجید میں الکتاب اور الحکمۃ کو عطف سے بیان کیا گیا ہے (کیونکہ ان دونوں میں آپس میں فرق ہے نظری مسائل کو حکمت اور عملی مسائل کو کتاب کہا جاتا ہے) اور بعض لوگوں نے کہا کہ زُبُر سے مراد پند و نصائح اور زجر و توبیخ کرنے والی باتیں ہیں جب کسی کو زجر و توبیخ کی جائے تو کہا جاتا ہے زَبَرْتُهٗ (میں نے اسے سختی سے

منع کیا) - ابن عامر نے لسے بالزُّبُر (با، جارّہ داخل کرکے وَالکتاب پڑھا ہے اور ہشام نے بِالبَیِّنٰت وَالزُّبر و بالکتابِ (بدخول البا، علی الکتاب غیر الزبر) پڑھا ہے اُن کی دلیل یہ ہے کہ البَیِّنٰت اور (بصورتِ اوّل) الزُّبر اور (بصورت دوم) الکتاب میں بھی مغایرت تامّہ موجود ہے -

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے -

(تصدیق کرنے والے کے لیے وعدۂ جزا ہے اور جھٹلانے والے کے لیے وعیدِ عذاب - اور اسے تنوین کے ساتھ منصوب ذَائِقَةٌ الْمَوْتَ اور تنوین کے بلغیر منصوب ذَائِقَةُ الْمَوْتَ بھی پڑھا گیا ہے (کیونکہ صیغۂ صفت کے مابعد کو اُس کا مفعول بھی قرار دیا سکتا ہے یعنی مضاف اگر صفت کا صیغہ ہو تو اُس کا مضاف الیہ منصوب بھی ہو سکتا ہے) جیسے شاعر نے کہا ؎

فَأَلْفَيْتُهُ غَيْرَ مُسْتَعْتِبٍ
وَلَا ذَاكِرُ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا

(اس شعر میں بھی ۱- ذَاكِرُ اللّٰهِ - ۲- ذَاكِرٌ اللّٰهَ - ۳- ذَاكِرُ اللّٰهَ تینوں صورتیں جائز ہیں-)

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ اور تمیں پورا پورا بدلہ ملے گا -

یعنی تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ مکمل اور پورا پورا دیا جائے گا خواہ وہ (اعمال) بھلائی کے تھے یا برائی کے -

يَوْمَ الْقِيَامَةِ قیامت ہی کے روز -

جس دن تم قبروں سے کھڑے ہو گے - اور لفظ "توفیہ" (پوری پوری ادائیگی) سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کچھ اجر و ثواب اُس سے پہلے بھی مل جائے گا - اور اس کی تائید حضور علیہ السلام کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ

مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ (قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے)۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا۔

یعنی اُس سے دُور رکھا گیا اور زُحْزِحَ اصل میں کلمہ "الزَّح" کو دوبارہ لانے سے بنتا ہے اور "الزَّح" کا معنی ہے جلدی سے کھینچ لینا۔

وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا۔

نجات پاکر کامیاب ہوا اور اپنا مقصود پا گیا اور "فوز" کا معنی ہے اپنی چہیتی چیز کا حاصل کرنا۔ اور آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ وَيُدْخَلَ الْجَنَّةَ فَلْتُدْرِكْهُ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْتِي إِلَى النَّاسِ مَا يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ" {جو شخص پسند کرتا ہے کہ اُسے آگ سے بچا یا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے تو اُسے اُس کی موت اِس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہو جو وہ اپنے ساتھ کیا جانا پسند کرے۔}

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں۔

یعنی اس (دنیا) کی لذتیں اور اس کا بناؤ سنگار، رغبتیں اور دلچسپیاں۔

إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ صرف دھوکے کا سودا ہے۔

(اصلی مقصود بنانے کے قابل نہیں)۔ دنیوی زندگی کو ایسے سامانِ تجارت سے تشبیہ دی ہے جس کی حقیقت کو خریدار سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اور اُسے فریب دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ خرید لیتا ہے۔ اور یہ اُس شخص کے متعلق کہا

ہے جو دُنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے اور جو شخص اِس (دنیوی زندگی) سے آخرت طلب کرے تو یہ اُس کے لیے (کامیابی تک) پہنچانے کا ذریعہ ہے — اور غُرور مصدر ہے یا غارٌّ (اسم فاعل) کی جمع ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ البتہ آگے اور آزمائے جاؤ گے۔

(یعنی وقتاً فوقتاً تم پر حوادث آئیں گے ورنہ اللہ تعالیٰ آزمانے کے حقیقی معنی سے پاک ہے کیونکہ وہ عالم الغیب ہے ۱۲ منہ) (لام قسمیہ ہے)۔

فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ اپنے مالوں میں۔

یعنی تمہیں (اپنی دولت) خرچ کرنے کا مکلّف بنایا جائے گا اور تمہارے مالوں پر آفتیں (نقصان وغیرہ) آئیں گی۔

وَاَنْفُسِکُمْ اور اپنی جانوں میں (آزمائے جاؤ گے)۔

جہاد (فرض کرنے) سے کچھ قتل ہوں گے، کچھ قیدی ہونگے اور کچھ زخمی ہونگے۔ اور اُن چیزوں کے ساتھ (آزمایا جائے گا) جو انسانی نفوس پر آتی ہیں از قبیل خوف و مرض و تھکن وغیرہ۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا اور البتہ آگے کو اور سُنو گے بہت سی باتیں دل آزاری کی لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں اور اُن لوگوں سے جو کہ مشرک ہیں۔

مثلاً وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہجو کریں گے اور دین (اسلام) میں طعن (و تشنیع) کریں گے اور کافروں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھاریں گے — مسلمانوں کو ان باتوں کی اطلاع قبل از وقوع دے دی تاکہ وہ اپنے آپ کو ان پریشانیوں کے خلاف صبر و برداشت کا عادی بنالیں

اور اِن سے نپٹنے کے لیے (ابھی سے) تیار ہو جائیں ایسا نہ ہو کہ ان پریشانیوں کا
(یکبارگی) نزول ان کی مزید پریشانی کا باعث بنے۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا اور اگر صبر کرو گے۔

ان سب مندرجہ بالا تکالیف پر۔

وَتَتَّقُوْا اور پرہیز رکھو گے۔

یعنی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو گے۔

فَاِنَّ ذٰلِكَ تو یہ (صبر و تقویٰ)۔

مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ تاکیدی احکام میں سے ہے۔

ایسی باتوں میں سے جن کا عزم ضروری ہے یا جن کا اللہ نے عزم کیا ہے یعنی
ان کا حکم دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے۔ اور عزم لُغت میں کسی چیز کے نافذ کرنے
کے بارے میں پختگی رائے کو کہتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے لیا (عہد)۔

یعنی وہ عہد یاد کرو۔

مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اہلِ کتاب سے یہ عہد۔

یہاں اہلِ کتاب سے (توراۃ و انجیل کے) علماء (متقدمین) مُراد ہیں۔

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ کہ اس کتاب کو تمام
لوگوں کے روبرو ظاہر کر دینا اور اسے پوشیدہ مت کرنا۔

اُن (علماء) سے جو خطاب ہوا تھا اُسے بعینہٖ نقل کر دیا گیا اور ابن کثیرؒ
ابو عمرو اور عاصم نے بروایتِ ابن عیاش (بصیغہ غائب) لَيُبَيِّنُنَّهٗ ــ
وَلَا يَكْتُمُوْنَهٗ پڑھا ہے کیونکہ علماء غائب ہیں اور لام جواب قسم ہے۔
(وہ قسم) جس کی بجائے اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ اللہ کا قول آیا ہے (کیونکہ

أخذ میثاق اور قسم ایک ہی چیز ہے) اور ضمیر (مفعول) کتاب کے لیے ہے۔

فَنَبَذُوْهُ سو اُن لوگوں نے اُسے پھینک دیا۔

(ضمیر غائب مفعولی ہے) مُراد میثاق ہے۔

وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ اپنے پسِ پُشت۔

یعنی اُنہوں نے اُس کی رعایت و پاس نہ کیا اور اُس کی جانب توجّہ نہ کی اور نَبَذَ وَرَآءَ الظّهْرِ (پسِ پشت ڈال دینا) کسی بات کے (اعتبار نہ کرنے) شمار میں نہ لانے اور توجہ نہ کرنے سے مَثَل ہے اور اس کی ضد "جَعَلَ نصبُ العینین (مرکزِ اَنظار بنالینا)" اور إلقاء بین عَیْنَیه (آنکھوں کے سامنے رکھنا) ہے (یعنی اُس نے فلاں کام کو اپنا نصب العین قرار دے لیا)۔

وَاشْتَرَوْا بِهٖ اور اُس کے مقابلہ میں لے لیا۔

اُس کا معاوضہ لے لیا۔

ثَمَنًا قَلِیْلًا کم حقیقت معاوضہ۔

ثمن قلیل (تھوڑی قیمت) سے مُراد دُنیوی ساز و سامان اور اغراضِ دنیا ہیں (جو آخرت کے مقابلے میں جتنی بھی ہوں کم حقیقت اور گھٹیا ہیں)۔

فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ سو بُری چیز ہے جسے وہ لوگ لے رہے ہیں۔

جو وہ اپنی جانوں کے لیے پسند کر رہے (بُرا ہے) اور آنحضور علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس شخص نے علم کو اُس کے اہل سے چھپایا اُسے (قیامت کے دن) آگ کی لگام دی جائے گی۔ حضرت علیؓ نے (بھی) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے عہد لیا کہ وہ سیکھیں گے مگر اس سے قبل اُس نے اہلِ علم سے عہد لیا کہ وہ سکھائیں گے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار (بد) پر خوش ہوتے ہیں اور جو (نیک) کام نہیں کیا اُس پر چاہتے ہیں کہ اُن کی تعریف ہو سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ خاص طور پر کے عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے۔

خطاب رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے اور جنہوں نے لَا تَحْسَبَنَّ (واحد حاضر) کی بجائے لَا تَحْسَبُنَّ (جمع حاضر کا صیغہ) پڑھا ہے وہ کہتے ہیں کہ خطاب آنحضور علیہ السلام اور مؤمنین سے ہے اور (حَسِبَ کا) پہلا مفعول الّذین یَفْرَحُوْنَ اور دوسرا بِمَفَازَةٍ ہے اور لَا تَحْسَبَنَّهُم (دوبارہ) تاکید کے لیے آیا ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ لوگ جو فریب دہی کرتے اور حق کو چھپاتے ہیں اور جنہوں نے میثاقِ الٰہی کو پورا نہ کیا اور اظہارِ حق نہ کیا اور سچی باتیں لوگوں سے نہ کہیں آپ انہیں عذاب سے بچنے والے گمان نہ کریں یہ کہ وہ عذاب سے نجات پاکر کامیاب ہو جائیں گے اور ——— ابنِ کثیر اور ابو عمرو نے پہلے مقام پر (واحد مذکر غائب) لَا يَحْسَبَنَّ اور دوسری جگہ (جمع مذکر غائب) لَا يَحْسَبُنَّهُم پڑھا ہے اس بناء پر کہ الّذین یفرحون فاعل ہے اور اس صورت میں لَا يَحْسَبَنَّ کے دونوں مفعول محذوف ہوں گے۔ اور دوسری جگہ لَا يَحْسَبُنَّهُم کے دونوں مفعول اُس کے دونوں مفعولوں پر دلالت کرتے ہیں اور وہ (چونکہ) پہلے لَا يَحْسَبَنَّ کا مؤکد ہے [مؤکد اور مؤکَّد اصل میں ایک ہیں لہذا اُس کے مفعول پہلے کے مفعول ہونگے۔ پہلا مفعول (هُم یعنی) انفسهم اور دوسرا مفعول بمفازةٍ من العذاب] گویا

یوں کہا گیا کہ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا، فَلَا یَحْسَبَنَّ اَنْفُسَھُمْ بِمَفَازَۃٍ ـــ یا مفعولِ اوّل محذوف ہے اور لَا یَحْسَبُنَّھُم فعلِ اوّل، اُس کے فاعل اور معفولِ محذوف (تینوں) کی تاکید ہے۔

وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (بلکہ) اور اُن کو دردناک سزا ہوگی۔

اُن کے کفر اور فریب دہی کی وجہ سے۔

شانِ نزول: ۱- روایت ہے کہ آنحضور علیہ السلام نے یہود سے تورات کے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے توراۃ میں لکھے کے خلاف بیان کیا اور یوں ظاہر کیا گویا اُنہوں نے سچ ہی کہا ہے پھر اپنے کیے پر بہت خوش ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۲- یہ بھی کہا گیا کہ بعض وہ لوگ جو غزوہ میں شامل نہ ہوئے تھے پھر اُنہوں نے عُذر کیا تھا کہ اُنہوں نے کسی مصلحت کی بنا پر تخلّف کیا ہے پھر اُس پر تعریف چاہی تھی۔ اُن کے بارے میں نازل ہوئی۔

۳- یہ بھی کہا گیا کہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ اپنی منافقت پر خوش ہوتے تھے اور مسلمانوں سے اُس ایمان کے بارے میں تعریف چاہتے تھے جو درحقیقت وہ نہ لائے تھے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی۔

لِلّٰهِ کی تقدیم مفیدِ تخصیص ہے، اَرض و سماء و مافیہما کی مِلک صرف اللہ ہی کی ہے لہذا وہی اُن کے (اُمور د) معاملات کا مالک ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

اور چونکہ وہ ہر کام پر قادر ہے لہذا اُن کو سزا دینے پر بھی قادر ہے ـــــ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اُن (یہود) کے (اِس) قول کا جواب ہے (جو اُنہوں نے کہا تھا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیر ـــــ)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہلِ عقل کے لیے۔

کیونکہ صانع (حقیقی) کے وجود پر، اُس کی وحدانیت پر، اُس کے کمالِ علم پر اور کمالِ قدرت پر دلائلِ واضحہ موجود ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایسی عقلیں رکھتے ہیں کہ وہ حسیّات اور وہم کی آلودگیوں سے پاک، صاف اور خالص ہیں جیسا کہ پہلے سورۃ بقرہ میں بھی گزرا ـــــ اور اس آیت میں تین چیزوں کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا وجہ یہ ہے کہ تغیّر ہی مدارِ استقلال ہیں اور یہ (تینوں) تغیّر کے جملہ اقسام کو قبول کرتی ہیں (اور سب اشیاءِ کائنہ کا احصاء تو ممکن ہی نہیں) پس یا تو یہ تغیّر کسی چیز کی ذات میں ہوگا جیسے رات اور دن کا تغیّر یا کسی چیز کے کسی جزء میں ہوگا جیسے عناصر میں ان کی صورتوں کی تبدیلی کی وجہ سے تغیّر (واستحالہ) ہوتا ہے۔ یا یہ کہ وہ تغیر نہ تو ذاتِ شیٔ میں ہو نہ جزءِ شیٔ میں بلکہ خارجِ شیٔ میں ہو جیسے افلاک کا تغیّر اُن کی وضع کے بدلنے سے ـــــ اور آنحضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اُس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو یہ آیت کریمہ پڑھے اور پھر اس میں غور نہ کرے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں

کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی۔

یعنی تمام حالتوں میں اُس کی یاد میں رہتے ہیں۔ اور آنحضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص چاہے کہ جنّت کے باغات سے (لطف اندوز ہو اور) کھائے پیئے اُسے چاہیے کہ اللہ کو زیادہ یاد کرے (مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَرْتَعَ فِیْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ فَلْیُکْثِرْ ذِکْرَ اللّٰہِ) —— اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ حسبِ طاقت ان تینوں حالتوں میں نماز پڑھتے ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے عمران بن حصین سے فرمایا: صَلِّ قَائِمًا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰی جَنْبٍ تُوْمِیْ اِیْمَاءً (کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو اور اگر اتنی طاقت نہ رہے (کہ کھڑے ہو سکو) تو بیٹھ کر اور اگر اتنی طاقت بھی نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہی سہی جبکہ تم اشارے سے پڑھو گے)۔ اور اسی آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ نے حجّت پکڑی ہے کہ مریض اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ کر اور اپنے جسم کے اگلے حصّوں کو قبلہ رُخ کر کے نماز ادا کرے —— (مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دوسری حدیث شریف کو دلیل بنایا جس میں الفاظ ہیں: "یُصَلِّیْ مُسْتَلْقٍ عَلٰی قَفَاہُ")۔

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

استدلال کی خاطر، (غور کرتے ہیں کہ مخلوق سے خالق اور مصنوع سے صانعِ اعظم تک پہنچا جائے) اور عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی خاطر۔ اور یہ (غور و فکر) تمام عبادات سے افضل ہے جیسا کہ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا: "لَا عِبَادَۃَ کَالتَّفَکُّرِ (تفکّر کی مانند کوئی عبادت نہیں) اس لیے کہ یہ دل سے اور تخلیقِ کائنات کے مقصود سے (تعلّق و خصوصیت رکھتی ہے —— اور

آپ نے یہ بھی فرمایا: بَيْنَمَا رَجُلٌ مُسْتَلْقٍ عَلٰى فِرَاشِهٖ إِذْ رَفَعَ رَأْسَهٗ فَنَظَرَ إِلَى السَّمَاءِ وَالنُّجُوْمِ فَقَالَ أَشْهَدُ أَنَّ لَكَ رَبًّا وَ خَالِقًا ــــ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ــــ فَنَظَرَ اللّٰهُ إِلَيْهِ فَغَفَرَ لَهٗ [جب کوئی آدمی اپنے بستر پر لیٹا ہو اور یونہی سر اُوپر اُٹھائے پھر وہ آسمان اور (اُس کے) ستاروں کو دیکھے اور کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ (اے آسمان) تیرا بھی کوئی پروردگار اور خالق ضرور ہے ــــ اے اللہ مجھے بخش دے ــــ تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف نظر (رحمت) کرتے ہیں اور اُسے بخش دیتے ہیں] اور یہ واضح دلیل ہے علم اصول (علم العقائد اور معرفت الٰہی) کے شرف پر اور اُس میں مشغول لوگوں کی فضیلت پر۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اسے لایعنی پیدا نہیں کیا۔

اس سے پہلے "قول" کا صیغہ مقدر ہے گویا یوں ہے: يَتَفَكَّرُوْنَ قَائِلِيْنَ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ــــ اور هٰذَا کا اشارہ اُس چیز کی طرف ہے جس میں غور و فکر کیا جا رہا ہے یعنی خلق (سموات و ارض) اس بناء پر کہ اس تخلیق سے مراد آسمان و زمین ہیں۔ یا یہ اشارہ (مُطْلَقًا) آسمان و زمین کی طرف ہے اور اسم اشارہ تثنیہ کی بجائے واحد اس لیے لاسئے کہ آسمان و زمین بمعنی مخلوق واحد ہیں ــــ اور مطلب یہ ہے کہ (اے اللہ) آپ نے اسے بیکار بغیر کسی حکمت کے ختم ہو جانے والا نہیں بنایا بلکہ آپ نے اسے عظیم حکمتوں پر مبنی پیدا فرمایا ہے منجملہ اُن (حکمتوں) کے یہ ہے کہ وہ انسانی وجود کا مبدء (اور آغاز کی جگہ) بنیں اور اُس کی روزی کے اسباب اُن میں مہیا ہوں اور ایسی دلیل (و حجت) حاصل ہو جو تیری معرفت کی طرف

رہنما ہو اور اُس (انسان) کو تیری فرمانبرداری پر اُبھارے تاکہ وہ ابدی حیات
اور تیری ہمسائیگی میں سعادتِ سرمدی حاصل کر سکے۔
سُبْحٰنَكَ ہم آپ کو مُنَزَّہ سمجھتے ہیں۔
(فعل سَبَّحْتُ ہمیشہ محذوف ہوتا ہے اور یہ اُس کا مفعول مطلق ہے)
تو عبث اور باطل تخلیق سے پاک ہے اور یہ جملۂ معترضہ ہے۔
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ سو ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لیجیے۔
خلقِ سموات وارض میں غور وفکر کرنے میں ہم سے جو کوتاہی واقع ہوئی
ہو اور جن باتوں پر عمل کرنے میں ہم پورے نہ اُتر سکے ہوں جس کا تقاضا یہ
(غور وفکر) کرتا ہے (آپ ہمیں معاف فرما دیجیے اور عذابِ دوزخ سے بچائیے)
—— اور فا، شروع میں لانے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دلالت کرتی ہے اس بات
پر کہ تخلیقِ سموات وارض جس مقصد کے لیے ہوئی اُنہیں اس بات کا علم ہو
گیا ہے اور اِس بات نے اُنہیں پناہ مانگنے پر مجبور کیا ہے (کہ وہ سمجھ گئے کہ
جتنا کچھ ہم جان سکے ہیں اس سے بھی زیادہ حکمتیں پوشیدہ ہیں)۔
رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ
اے ہمارے پروردگار! بے شُبہ آپ جسے دوزخ میں داخل کریں اُسے واقعی
رُسوا ہی کر دیا۔
غایت درجہ رُسوائی۔ اور اس کی مثال یہ ہے جیسے کہتے ہیں: مَنْ أَدْرَكَ
مَرْعَى الصَّمَّانِ فَقَدْ أَدْرَكَ { (جس نے صمّان کی چراگاہ پالی اُس نے پالی)
(یعنی اس سے تاکید مراد ہے ورنہ آگ میں جانا اور پھر رسوائی اس سے زیادہ کیا
ہو گی) } اور مُراد اس سے مستعاذ منہُ (جس سے پناہ مانگی جا رہی ہے اُس کی)
ہولناکی کا بیان ہے اور یہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے آیا کہ وہ عذاب

دوزخ سے کتنا زیادہ خوف رکھتے ہیں اور اُس سے پناہ مانگتے ہیں اور اس میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ عذاب روحانی زیادہ پریشان کن ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ اور ایسے بے انصافوں کا کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں۔

(ظالمین سے آگ میں) داخل کیے جانے والے مُراد ہیں اور یہاں مُضمَر (یعنی ضمیر لانے) کی بجائے مُظہَر (اسم ظاہر ظالمین) رکھا جو اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُن کا ظلم ہی اُن کے آگ میں داخل ہونے اور دوزخ کے عذاب سے چھڑانے سے نُصرت کے انقطاع کا سبب ہوا اور اس نفیِ نصرت سے نفیِ شفاعت لازم نہیں آتی کیونکہ نُصرت کا معنیٰ ہے جبراً کسی کو چھڑا لینا (لہذا جبراً چھڑانا اور بات ہے اور سفارش کرنا اور بات ہے)۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ

اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک پُکارنے والے کو سُنا کہ ایمان لانے کے واسطے اعلان کر رہے ہیں۔

یہاں فعل کو سُننے والے پر واقع کیا گیا ہے اور مسموع کو حذف کر دیا گیا ہے اس وجہ سے کہ اُس کا وصف مسموع پر دلالت کرتا ہے اور اس طرح مبالغہ پیدا کیا گیا ہے جو مسموع کے ذکر کر دینے سے پیدا نہ ہوتا (گویا وہ منادی خود نِداء بن گیا تھا) اور "منادی" کو نکرہ مطلق لایا گیا پھر اُس کو صفت يُنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ سے مقید کر دیا گیا تاکہ اُس کی عظمت مزیت ظاہر ہو۔ اور اُس (منادی) سے مُراد آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں ــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے قرآن مجید مُراد ہے اور نِداء اور دُعا

اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ "اِلیٰ" اور "لام" کے صلہ سے متعدی ہوتے ہیں (یعنی) جب انتہاء کا معنیٰ پیدا کرنا ہو (تو "اِلیٰ") اور جب اختصاص پیدا کرنا ہو (تو "لام" لایا جاتا ہے)۔

أَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لے آئے۔

یہ اصل میں بِأَن اٰمِنُوا تھا (کہ ایمان ہمیشہ باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے)۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اے ہمارے پروردگار! پھر ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرما دیجیے۔

(ذُنُوب سے) کبائر (گناہ) مُراد ہیں کیونکہ اُن پر سزا بھی ہوگی۔

وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا اور ہماری بدیوں کو بھی ہم سے زائل کر دیجیے۔

ہمارے صغیرہ گناہ بھی دُور کر دیجیے۔ کیونکہ ذات میں تو یہ بھی بُرے ہیں تاہم یہ دُور کیے جانے والے ہیں اُس شخص سے جو کبائر سے بچتا رہے۔ (جیسا کہ ارشاد ہے: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ــــ الخ القرآن)

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دیجیے۔

"اس حال میں کہ ہم اُن کی صحبت کی نسبت وخصوصیت رکھنے والے ہوں اُنہی کے زمرہ میں شمار ہونے والے ہوں"۔ اور اس میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ اللہ کی ملاقات سے محبّت رکھنے والے ہیں اور جو اللہ سے ملاقات پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے ملاقات پسند کریں گے ــــ اور اَبرار

بَرٌّ یا بَارٌّ کی جمع ہے جس طرح (ربٌّ کی جمع) اَرباب اور (صاحب کی جمع) اَصحاب آتی ہے۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ اے ہمارے پروردگار! اور ہمیں وہ چیز بھی دیجیے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے۔

کہ اپنے پیغمبروں کی تصدیق پر عطا کروں گا ثواب (و اجر) وغیرہ میں سے ـــ حکم کردہ اُمور کی تعمیل کا اظہار کر چکنے کے بعد اُس پر (اجر و ثواب کے) وعدہ (کے ایفاء) کی درخواست کی ـــ وعدہ خلافی کے خوف سے نہیں بلکہ اس خدشے کی بنا پر کہ کہیں سُوءِ عاقبت کی وجہ سے اُنہیں موعودین میں ہی شمار نہ کیا گیا ہو ـــ یا اس لیے کہ فرمانبرداری میں کوتاہی ہو گئی ہو ـــ یا اپنی بندگی اور عاجزی کے اظہار کے لیے (ایسا کہا) ـــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عَلٰی "متعلق بہ محذوف ہو اور تقدیرِ عبارت یوں ہو مَا وَعَدْتَنَا مُنَزَّلًا عَلٰی رُسُلِكَ مَحْمُولًا عَلَيْهِمْ (وہ اجر و ثواب جو آپ نے اپنے انبیاء پر نازل کرتے ہوئے وعدہ فرمایا ـــ اور اُن پر ایمان لانے پر اُسے مشروط رکھا) اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کا معنی ہے عَلٰی اَلْسِنَةِ رُسُلِكَ { جو آپ نے وعدہ فرمایا اپنے انبیاء کی زبانوں پر یعنی اُن کے ذریعے }۔

وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور ہمیں قیامت کے روز رُسوا نہ کیجیے۔

یعنی آپ ہمیں اُن اعمال سے محفوظ رکھیے جو اُس (رُسوائی) کا سبب بنیں۔

اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ یقیناً آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔

ایماندار کو اجر و ثواب دینے میں اور پکارنے والے کی پکار کا جواب

دینے میں۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ "المیعاد" سے مراد موت کے بعد اُٹھایا جانا ہے اور رَبَّنَا کو دوبارہ لانا عاجزی میں مبالغہ کی خاطر ہے اور اِس سے طلب کردہ اشیاء کا بذاتہا مستقل ہونا اور اُن کا بلند مقام وغیرہ ظاہر ہوتا ہے اور آثار میں ہے کہ جسے کوئی مشکل کام آپڑے تو وہ پانچ بار "رَبَّنَا" کہے، اللہ تعالیٰ اُسے اُس سے نجات دے گا جس سے وہ ڈرتا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ سو منظور کر لیا اُن کی درخواست کو اُن کے ربّ نے۔

اور یہ (اِستجاب باب استفعال سے آیا ہے جو) باب افعال (یعنی اَجاب) سے زیادہ مخصوص (معنی دیتا) ہے (کیونکہ جب حروف بڑھ جائیں تو معانی بھی بڑھ جاتے ہیں) اور یہ (بغیر کسی صلہ کے) براہِ راست بھی متعدّی ہوتا ہے اور لام کے صلہ سے بھی۔

أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا۔

(أَنِّي سے پہلے "بَاء" مقدّر ہے گویا اصل میں یوں تھا) بِأَنِّي لَا أُضِيعُ ــــــ اور اسے إِنِّي (بکسر الہمزہ) بھی پڑھا گیا اس بناء پر کہ یہ (اللہ تعالیٰ کا) قول ہے۔ (اور قول کے صیغوں کے بعد اِنّ بالکسر آیا کرتا ہے)۔

مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

(دونوں کے لیے یکساں قانون ہے ۱۲ منہ) (مِنْ بیانیہ ہے اور یہ جملہ عامل کی وضاحت کے لیے آیا ہے۔

بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ تم آپس میں ایک دوسرے کے جزء ہو۔

کیونکہ مرد عورت سے ہے اور عورت مرد سے۔ یا یہ مراد ہے کہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ یا یہ کہ دونوں جنسوں میں (معاشرے میں) اتصال و اتحاد موجود ہے یا یہ کہ دین میں دونوں باہم اتفاق و اتحاد رکھتے ہیں۔ یہ جملۂ معترضہ ہے جس سے عاملین میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی شرکت بیان فرمائی ہے۔

شانِ نزول: روایت ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں سنتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہجرت میں مردوں کا ذکر کرتے ہیں اور عورتوں کا ذکر نہیں کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا سو جن لوگوں نے ترکِ وطن کیا۔

یہ تفصیل ہے عاملین کے اعمال کی اور اُس چیز کی جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے بدلے کے طور پر تیار کی ہے بطور مدح اور تعظیم کے اُس کا ذکر کیا گیا اور معنیٰ یہ ہے کہ جن لوگوں نے شرک (و معاصی) کو ترک کر دیا یا یہ کہ دین کی خاطر اپنے قبیلوں اور وطن کو چھوڑ دیا۔

وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے میری راہ میں (اللہ پر) ایمان لانے کی وجہ سے اور اللہ (کے احکام پر عمل کرنے کی وجہ سے)۔

وَقٰتَلُوْا اور جہاد کیا۔

یعنی کفار سے لڑے۔

وَقُتِلُوْا اور شہید ہو گئے۔

جہاد میں اور حمزہ اور کسائی نے اس کے اُلٹ (یعنی پہلے قُتِلُوْا اور پھر

قَاتَلُوْا) پڑھا ہے اور یہ کہا ہے کہ واؤ سے ترتیب لازم نہیں اور دوسری قراءت افضل ہے یا یہ مراد ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور باقی سب جہاد کرتے رہے اور کمزور نہ پڑے ـــــ اور ابن کثیر اور ابن عامر نے قُتِّلُوْا تشدید سے پڑھا ہے اور اس سے تکثیر مراد لی ہے۔

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ضرور اُن لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا۔

(تکفیر سیئات کا معنیٰ ہے برائیاں) مٹا دوں گا۔

وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور ضرور اُنہیں ایسے باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ عوض ملے گا اللہ تعالیٰ کے پاس سے۔

یعنی اُنہیں یہ ثواب دوں گا جبکہ یہ ثواب اللہ کی جانب سے اُس کے فضل و کرم کی وجہ سے ہوگا اور ثَوَابًا (مصدر یعنی) مفعول مطلق ہے جو فعل محذوف اُثِیْبُ کی تاکید میں لایا گیا۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

یعنی طاعات پر (حُسنِ جزاء اُس کے پاس موجود ہے) اور وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ آپ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے۔

خطاب آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے اور مراد آپ کی اُمّت ہے یا آپ کو مَا کَانَ عَلَیْہِ (یعنی اپنی سابقہ حالت) پر ثابت قدم رکھنا

مقصود ہے جس طرح فَلَا تُطِعِ الْمُکَذِّبِیْنَ میں ہے یا ہر واحد کو خطاب ہے اور نہی اصل میں مخاطب ہی کو ہے مگر عبارت میں نہی تَقَلُّب پر وارد ہوئی ہے۔ مبالغہ کی خاطر (بلاغت میں یہ مجاز عقلی ہے) اور یہ کہ مسبّب کی جگہ سبب کو لایا گیا کہ تقلب سبب اور دھوکا کھانا مسبّب ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کفار کی ظاہری فراخی اور خوشحالی پر نظر نہ کریں اور نہ دھوکا کھائیں اُن کی ظاہری وسعت سے اُن کے کاروبار، تجارت اور کھیتیوں وغیرہ میں۔

شانِ نزول: روایت ہے کہ بعض مومنین نے مشرکین کی خوشحالی اور آرام کی زندگی کو دیکھ کر کہا کہ یہ دشمنانِ خدا کیسی بھلائی کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہم (مسلمان ہونے کے باوجود) بھوک اور مشقت اٹھا رہے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مَتَاعٌ قَلِيلٌ یہ چند روزہ بہار ہے۔

(کیونکہ مرتے ہی اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔ ۱۲ حاشیہ) مبتدا محذوف (ذَالِكَ التَّقَلُّب) کی خبر ہے یعنی یہ تقلب متاعِ قلیل ہے۔ کیونکہ اس کا عرصہ بہت مختصر ہے اُس نعمت کے مقابلے میں جو اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے تیار کی ہے۔ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "دنیا آخرت کے مقابلے میں سوائے اس کے نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی دریا میں ڈالے، پھر وہ دیکھے کہ (اُس کی انگلی دریا سے) کیا کچھ لے کر لوٹتی ہے۔

ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ پھر اُن کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور وہ بری آرامگاہ ہے۔

یعنی جو کچھ انہوں نے اپنی جانوں کے لیے تیار کیا ہے (وہ برا ہے)

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ لیکن جو لوگ خدا سے ڈریں اُن کے لیے باغات ہیں جن میں نہریں جاری ہوں گی وہ اُن (باغات) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے۔

النُّزُل اور النُّزْل اُس کھانے پینے اور خاطر مدارات کو کہتے ہیں جو (آنے والے) مہمان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ابو الشعر الضبی کہتا ہے:

وَكُنَّا إِذَا الْجَبَّارُ بِالْجَيْشِ ضَافَنَا ؎
جَعَلْنَا الْقَنَا وَالْمُرْهَفَاتِ لَهٗ نُزُلًا

{جب کوئی جابر (بادشاہ) اپنے لشکر کے ساتھ ہمارا مہمان ہوتا ہے (یعنی ہم پر حملہ کرتا ہے) تو ہم نیزوں اور تیز تلواروں سے اُس کی مہمان نوازی کرتے ہیں}۔

اور نزلاً حال ہے جنّٰت سے لہذا منصوب ہے (ذو الحال کا معرفہ ہونا لازم ہے مگر یہاں نکرہ ہے تو وجہ یہ ہے کہ یہ نکرہ موصوفہ ہے جنّٰتٌ تجری من تحتها الْأَنْهٰرُ اور حال میں کوئی عامل ہوا کرتا ہے تو یہاں) "لَهُمْ" (جار مجرور ظرف ہوتا ہے) میں جو ظرف ہے وہ عامل ہے ـــــ اور بعض (نحویوں) نے کہا کہ یہ مفعول مطلق ہے اور تقدیر عبارت یُوں ہے: "اِنْزِلُوْهَا نُزُلًا"۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ اور جو چیزیں خُدا کے پاس ہیں۔

اپنی کثرت اور دوام کی وجہ سے۔

خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ وہ نیک بندوں کے لیے بدرجہا بہتر ہیں۔

زیادہ اچھی ہیں بہ نسبت اُن چیزوں کے جن میں فُجّار لوٹ پوٹ رہتے ہیں وہ قلیل (وحقیر) اور سریع الزوال ہیں۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ اور بالیقین بعض لوگ اہلِ کتاب میں سے ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتقاد

رکھتے ہیں۔

(سیدنا)[1] عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور[2] یوں بھی کہا گیا کہ نجران کے چالیس آدمیوں، حبشہ کے بتیس اور روم کے آٹھ آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو پہلے نصاریٰ تھے پھر اسلام لے آئے۔ اور[3] یہ بھی کہا گیا کہ اصحمہ نجاشی کے متعلق نازل ہوئی۔ جبکہ جبریل علیہ السلام نے آنحضور علیہ الصلوۃ والسلام کو اس کی وفات کی خبر سنائی۔ پس آپ (جنازہ گاہ کی طرف) نکلے اور اُس کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ اس پر منافقین کہنے لگے: اس شخص کی طرف دیکھو ایک کٹر نصرانی پر نمازِ جنازہ پڑھتا ہے جسے اس نے دیکھا بھی کبھی نہیں —— اور اِنَّ بھی حرفِ تاکید ہے۔ اور "ل" بھی، دونوں جمع نہیں ہو سکتے یہاں اِنَّ کے اسم "مَنْ یؤمنُ" پر اس اصول کے تحت لام تاکید داخل نہیں ہو سکتا تھا مگر اِنَّ کے فوراً بعد من اھل الکتاب خبرِ مقدم (ظرف) آگیا جس نے اِنَّ اور اسم اِنَّ میں فصل پیدا کر دیا لہٰذا لام تاکیدی کا لانا جائز ہوا۔

وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ اور اُس کتاب کے ساتھ بھی جو تمہارے پاس بھیجی گئی

یعنی قرآنِ پاک۔

وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ اور اُس کتاب کے ساتھ بھی جو اُن کے پاس بھیجی گئی۔

یعنی دونوں کتابیں (تورات و انجیل)۔

خٰشِعِیْنَ لِلّٰہِ اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

یؤمن کے فاعل (مِنْ اَھلِ الکتاب مَنْ) سے حال واقع ہوا ہے اور

'مَنْ' لفظاً مفرد اور معنیً جمع ہے یہاں معنیٰ کا اعتبار کر کے حال کو بھی جمع لایا گیا۔ { مَنْ کے واحد لفظی اور جمع معنوی ہونے کا ثبوت من اراد الاخرۃ وسعی لہا الآیہ میں ہے }

لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلے میں کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے۔

اللہ کی آیات کی سودا بازی کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ جس طرح علمائے یہود و نصاریٰ میں سے تحریف کرنے والے کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے لوگوں کو اُن کا نیک عوض ملے گا اُن کے پروردگار کے پاس۔

وہ اجر جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کہ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ — { یہی لوگ ہیں جن کو دو اجر ملیں گے پہلی کتب و انبیاء پر ایمان لانے کا اور اس کتاب اور نبی پر ایمان لانے کا — }

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب کر دیں گے۔

کیونکہ وہ تمام اعمال کا علم رکھتے ہیں اور اُس کا بھی علم رکھتے ہیں جو یہ اعمال جزاء پانے کے حقدار ہیں اور اُسے مزید غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت نہیں اور مُراد یہ ہے کہ جس اجر کا وعدہ دیا گیا ہے وہ اُنہیں جلدی پہنچنے والا ہے کیونکہ سُرعتِ حساب سُرعتِ جزاء کی مقتضی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا اے ایمان والو! خود صبر کرو۔

فرمانبرداری اور اطاعت کے کاموں کی مشقت اُٹھانے کے بارے میں اور اُن تکالیف کے بارے میں جو تمہیں پہنچتی ہیں۔

وَصَابِرُوْا اور مقابلہ میں صبر کرو۔

اور جنگ کے شدائد پر صبر کرکے دشمن پر غلبہ حاصل کرو اور اپنے سخت ترین دشمن یعنی نفس کا مقابلہ کرو کہ خواہشات کی مخالفت کرکے صبر کا مظاہرہ کرو ــــ اور اُمر مطلق اصْبِرُوْا کے بعد دوبارہ صَابِرُوْا (باب مفاعلہ) کا صیغہ لایا گیا۔ یہ تخصیص اس لیے ہے کہ مطلق صبر سے کسی کے مقابلے میں صبر کرنا نسبتاً زیادہ مشکل ہے

وَرَابِطُوْا اور مقابلہ کے لیے مستعد رہو۔

یعنی اپنے جسموں کو اور اپنے گھوڑوں کو سرحدات اسلامی پر دشمن کے خلاف گھات میں لگائے رکھو اور اپنے نفوس کو اللہ کی طاعت پر لگائے رکھو جیسے فرمایا مِنَ الرِّبَاطِ انْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ (کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی انتظار میں رہنا بھی رباط ہی ہے۔) اور آنحضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا مَنْ رَابَطَ يَوْمًا وَلَيلَةً فِي سبيل اللهِ كَانَ كَعَدْلِ صِيَامِ شَهْرِ رَمضَانَ وَقِيَامِهِ لَا يُفْطِرُ وَلَا يَنْفَتِلُ عن صَلٰوتهٖ الا الحاجة (جو شخص ایک دن اللہ کی راہ میں سرحداتِ اسلامی پر اپنے آپ کو جمائے رکھے وہ مساوی ہوتا ہے اُس شخص کے جس نے رمضان کے روزے رکھے حتیٰ کہ افطار بھی نہ کیا اور راتوں کو قیام کیا اور نماز سے نہ ہٹا بلکہ مشغول ہی رہا سوائے کسی خاص حاجت کے)۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ۔

اُس کے ماسوا سے براءت و دستبرداری اختیار کرو تاکہ کامل اور انتہائی کامیابی پا جاؤ ـــــ یا یہ کہ اپنے آپ کو قبیح عادتوں سے بچاؤ کہ تین مقامات بالترتیب پا سکو۔ طاعتوں کی تکالیف پر صبر اور بُری عادات چھوڑنے میں (مصابرہ) نفس کا مقابلہ اور بارگاہِ کبریا کے ساتھ برابر رابطہ ـــــ ان تینوں کے نتیجہ میں تین چیزیں وجود میں آئیں گی جنہیں شریعت، طریقت اور حقیقت کا نام دیا جاتا ہے۔ {یعنی صبر علی مضض الطاعات کا نتیجہ شریعتِ کاملہ ہو گی۔ مُصابرۃ النفس فی رفض العادات سے طریقت (طاعات کا ملکہ اور صراطِ مستقیم کی راہ پانا وغیرہ) کا حصول ہو گا۔ پھر رابطہ بجناب الحق کا نتیجہ حقیقتِ تامہ تک باریابی ہو گا نیکی کی راہ مل جائے گی اور پھسلنے کا خطرہ کم ہو جائے گا اور یہی مقصود ہے (الواردات: الاحوال، لِتَرَصُّد: للانتظار)}

آنحضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: "جو شخص سورۃ آل عمران کی تلاوت کرے اُسے اس کی ہر آیت کے بدلے پُل صراط پر امان ملے گی" ـــــ اور آپ نے یہ بھی فرمایا: "جو کوئی اُس سورۃ کو جس میں آل عمران کا ذکر ہے (یعنی سورۃ آل عمران) جمعہ کے دن پڑھے اُس پر اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے سورج غروب ہونے تک رحمت بھیجتے رہتے ہیں" ـــــ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ الْمُعِیْنُ جَلَّ جَلَالُہٗ۔

التخيير من التفسير

سورۂ آلِ عمران

حضرت مولانا بیضاوی رحمہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ

برائے ایم

از

محمد حمزہ نعیم ایم۔اے (عربی)

...خانہ ۔ اُردو بازار۔ لاہور